جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جنوری 1995

مُدیر: خرم مُراد

إدارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

جلد ۱۲۱ | جنوری ۱۹۹۵ رجب ۱۴۱۵ھ | عدد ۱

فہرست مضامین

برائے ادارتی امور

منصورہ ملتان روڈ لاہور ۵۴۵۷۰ فون نمبر ۸۔ ۷۵۷۰۱۳۳ فیکس (۰۴۲) ۷۵۷۴۷۱۹

برائے انتظامی امور

ماہنامہ ترجمان القرآن :۔ ۵۔اے ذیلدار پارک ' اچھرہ ' لاہور۔

فون نمبر سرکولیشن :۔ ۷۵۸۷۹۲۶ انتظامی امور :۔ ۷۵۸۵۵۹۰

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بنک ڈرافٹ ترجمان القرآن لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔

کراس چیک قبول نہیں کیے جائیں گے۔

قیمت فی شمارہ : /۱۲ روپے ' زر سالانہ : /۱۲۰ روپے (اندرون ملک)

مشرق وسطی / ۴۵۰ روپے۔ بنگلہ دیش / ۳۰۰ روپے۔ یورپ / مشرق بعید ۶۰۰ روپے۔

امریکہ / کینیڈا / آسٹریلیا ۷۰۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ ' لاہور سے شائع کیا۔

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اچھرہ ' لاہور (پاکستان)

اشارات

خرم مراد

بلا مبالغہ آج [پاکستان کو] اپنی زندگی کے سب سے زیادہ خطرناک بحران کا سامنا ہے.... کوئی بھی ہوش مند یہ بازی لگانے کی جرات نہیں کرسکتا کہ اس بحران کی قیمت' آج اور مستقبل میں' کتنی بھیانک ادا کرنا ہوگی....[اس بحران سے نکلنے کے لیے حسب معمول جو تدابیر اختیار کی جائیں گی' وہ] ہمیں کس آتش فشاں تک لے جائیں گی' اس کے تصور سے ہی دل کانپ اٹھتا ہے۔ (ترجمان القرآن، اگست ۹۳)

۱۷ ماہ پیشتر یہ سطور لکھتے وقت یہ گمان نہ تھا کہ ایسا اتنی جلد ہو جائے گا! مگر آج ہمیں ایسے آتش فشاں پر لاکھڑا کیا گیا ہے جس کے گرم گرم لاوے کی حرارت ہر درد مند پاکستانی کا دل پگھلائے دے رہی ہے۔ قوم کے لیڈر قومی زندگی کی رگ رگ میں عدم رواداری' نفرت' محاذ آرائی' گالی گلوچ' تشدد اور قتل و خوں ریزی کا زہر ایک عرصہ سے گھولتے رہے ہیں' مگر گذشتہ چند برسوں میں وہ اس تیز رفتاری سے بڑھا ہے کہ آج جسد قومی کے بند بند سے خون رس رہا ہے۔ سیاسی نظام' انتقام' نفرت اور ہوس اقتدار کی ضربوں کی تاب نہ لاکر ٹوٹ پھوٹ رہا ہے' اور حکومت کی گاڑی بمشکل گھسٹ رہی ہے۔ حکمران دونوں ہاتھوں سے قومی دولت لوٹ کھسوٹ کر اپنے پیٹوں میں انگارے بھرنے میں مصروف ہیں' جب کہ عام آدمی کو دو وقت کی روٹی بھی میسر آنا مشکل ہو رہی ہے۔ کراچی جل رہا ہے' وہاں روز لاشیں گر رہی ہیں' روز اسکور بڑھ رہا ہے' مگر ہمارے نیرو بانسری بجانے میں مگن ہیں۔ کشمیر' ایٹمی صلاحیت اور معاشی آزادی جیسے اہم اور نازک قومی مفادات کو اسلحہ اور ڈالروں کے لالچ میں پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ مذہبی فرقہ واریت کے علم برداروں کے ہاتھوں مسجدوں اور سڑکوں پر جو خون ریزی ہو رہی وہ بھی ایک بہت بڑا ناسور ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ اگرچہ سیاسی فرقہ واریت کے علم برداروں کے ہاتھوں مسجدوں اور سڑکوں پر جو خون ریزی ہو رہی وہ بھی ایک بہت بڑا ناسور ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ پھر بھی مذہبی فرقہ واریت کو مسئلہ نمبر ایک صرف اس لیے بنایا جا رہا ہے کہ حکمرانوں کی بداعمالیوں پر سے توجہ ہٹ جائے اور اسلام بھی بدنام ہو۔

اگرچہ سیاسی عدم استحکام برقرار رکھنے کی حد تک میاں نواز شریف اور مسلم لیگ بھی ذمہ دار ہیں' لیکن گذشتہ دنوں میں پوری قومی زندگی جس شدید ابتری کا شکار ہوئی ہے اس کے لیے اصل ذمہ داری محترمہ بے نظیر بھٹو اور پیپلز پارٹی کی ہے۔ لوٹ کھسوٹ ہمیشہ ہوتی رہی ہے' لیکن ان کی حکومتوں نے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ گذشتہ حکومت کی جن بدعنوانیوں کو وہ ہدف تنقید بناتی رہی ہیں' وہی بدعنوانیاں اب کہیں زیادہ بڑے پیمانہ پر ہو رہی ہیں۔ ایک ایک سودے میں کروڑوں اور اربوں روپے کھائے گئے ہیں۔ اگر کہیں کسی کو سن گن مل گئی اور راز فاش ہو گیا' تو جھٹ اطمینان دلانے کے لیے تردید کر دی گئی' لیکن سودا ہو کر رہا۔ جھوٹ بولنے میں کسی کو کوئی عار نہیں۔ روزنامہ دی نیوز نے اس لوٹ مار کی ہوش ربا داستان بیان کی ہے۔

کراچی کی مظلوم' قیمتی زمین مسٹر بھٹو کے دور سے لٹائی جا رہی ہے۔ مشہور ہے کہ انھوں نے جام صادق علی سے کہا تھا کہ کم سے کم قائداعظم کا مزار اور میری کلفٹن کی رہائش گاہ کسی کو الاٹ نہ کرنا۔ میاں نواز شریف کے دور میں بھی یہی ہوتا رہا' اور محترمہ بے نظیر بھٹو بجا طور پر مذمت کرتی رہیں کہ اربوں روپے کی زمین کوڑیوں کے مول دی جا رہی ہے۔ برسر اقتدار آتے ہی 'ان کے وزیراعلیٰ' عبداللہ شاہ نے پہلے تو سارے پرانے الاٹمنٹ منسوخ کیے' لیکن چند ہی دن بعد ایک طرف وہی الاٹمنٹ انھی پرانے افراد کے نام بحال کرنا شروع کر دیے' اور دوسری طرف نئے الاٹمنٹوں کا ایک تار بندھ گیا۔

۲۱ اپریل ۱۹۹۴ کو چھ غیر معروف افراد کو سپر ہائی وے پر دس لاکھ مربع گز زمین' جس کی قیمت ۶۰۰ روپے مربع گز سے کم نہیں' ۲۵ روپے گز کے حساب سے الاٹ کی گئی۔ پھر ناقابل یقین کارروائی یہ ہوئی کہ چند دن بعد یہ بھی گھٹا کر دس روپیہ گز کر دی گئی۔ حکومت سندھ کو صرف ایک کروڑ روپے کی آمدنی ہوئی' مگر جو ہاتھ اس سودے کے پیچھے ہے اس نے کم سے کم ۶۰ کروڑ روپے بنا لیے۔

یہ ایک کروڑ روپیہ بھی بڑا "بھاری" نفع لگتا ہے ان ۴۰ ہزار روپوں کے مقابلے میں جو حکومت سندھ نے کورنگی انڈسٹریل ایریا میں چار لاکھ مربع کی قیمتی زمین بیچ کر کمائے۔ جس کی قیمت ۱۲۰۰ روپے گز سے کم نہیں' وہی زمین دس پیسے گز کے حساب سے اسی پارٹی کے نام بحال کر دی گئی جس کو مظفر حسین شاہ نے الاٹ کی تھی' اور اس نے کم سے کم ۴۰ کروڑ کی رقم نکالی۔

ایسا ہی معاملہ کلفٹن کے قریب ساڑھے تین لاکھ گز زمین کا ہوا۔ یہ زمین بھی پہلے مظفر حسین شاہ نے الاٹ کی تھی' مگر اس وقت صدر اسحاق خاں نے سودا منسوخ کرا دیا تھا۔ حکومت سنبھالتے ہی موجودہ وزیراعلیٰ نے منسوخی کا حکم واپس لے لیا' اور کراچی پورٹ ٹرسٹ کو بھی اپنے اس دعویٰ سے دستبردار کرا دیا جو وہ اس زمین پر رکھتی تھی۔

سندھ کے بعد 'محترمہ بے نظیر کا بس اسلام آباد کی زمینوں پر چلتا ہے۔ انھوں نے اپنے پہلے دور اقتدار کے صرف ۲۰ ماہ میں اسلام آباد میں ۲۵۴ پلاٹ تقسیم کیے 'جبکہ اس سے پہلے کے حکمرانوں نے ۱۱ سال میں صرف ۲۵۴ پلاٹ دیے تھے۔ لیک ویو ہوٹل کا سودا 'وہ اپنی ناگہانی برطرفی کی وجہ سے نہ چکا سکی تھیں۔ اب پھر سی ڈی اے نے ۹۰ ہزار گز کی انتہائی بیش قیمت زمین 'کسی قیمت کے عوض نہیں ' صرف منصوبہ میں شرکت کے عوض انٹر ہوٹل نامی کمپنی کو دے دی ہے۔

لوٹ مار کے مواقع زمینوں سے بڑھ کر تجارتی اور صنعتی سودوں میں زیادہ ہیں۔ رائس ایکسپورٹ کارپوریشن نے اچانک چار لاکھ ۵۰ ہزار ٹن چاول تین غیر ملکی کمپنیوں کو فروخت کر دیا۔ اس سے پہلے چاول ہر ہفتہ تھوڑی تھوڑی مقدار میں فروخت کیا جاتا تھا۔ جب یک دم اتنی بڑی مقدار فروخت کرنے کا اعلان ہوا تو اس پر احتجاج ہوا 'وزیر تجارت نے اسمبلی میں نظر ثانی کی یقین دہانی کی 'پھر چپکے سے یہ چاول اسی طرح 'سارے احتجاجات کے باوجود ' دو لاکھ ۱۰ ہزار ٹن گیہوں ۱۲۶ ڈالر فی ٹن کے حساب سے در آمد کیا گیا۔ جبکہ گورنمنٹ کی یوٹیلٹی کارپوریشن نے یہی گیہوں امریکا سے ۱۲۰ ڈالر کے حساب سے خریدا ہے۔ پانچ کروڑ اس سودے میں بن گئے۔

یلو کیب کے ۲۰۰ ارب کے جواب میں سبز ٹریکٹر کی اسکیم میں ۶۰ ہزار ٹریکٹر فراہم کرنے کے لیے ۹۰۰ ارب روپیہ لگایا جا رہا ہے۔ اس سے لوگ کتنی بالائی اتاریں گے 'اس کا کم سے کم تخمینہ بھی ہوش ربا ہے۔ مشرقی یورپ سے ڈیڑھ لاکھ روپے میں خریدے ہوئے ان ٹریکٹروں کی نہ کارکردگی آزمودہ ہے ' نہ سروس کی سہولتوں کا کوئی انتظام۔ جو بات یقینی ہے وہ یہ کہ ملک کی ٹریکٹر سازی کی صنعت تباہ ہو جائے گی جو ۸۰ ہزار خاندانوں کو روزگار فراہم کرتی ہے۔ دوسری طرف صرف ۲۰ ہزار نقد دے کر خریدنے والوں سے قرضوں کی عدم وصولی بنکوں کی کمر توڑ کر رکھ دے گی۔

ہب پاور پلانٹ کی قیمت بارہ لاکھ ڈالر فی میگاواٹ دی جا رہی ہے 'جبکہ دنیا بھر میں یہ قیمت چھ لاکھ ڈالر فی میگاواٹ سے زیادہ نہیں۔ یہ زائد رقم کون کون کھا رہا ہے 'اس کی تفصیلات ایک راز ہیں۔

پاکستان ٹیلی کمیونی کیشنز کے واؤچرز کی پہلی قسط ۲۰ روپے کی انتہائی ارزاں قیمت پر فروخت کی گئی ' اور فروخت کرتے ہی ان کی قیمت ۵۵ روپے تک پہنچ گئی۔ اس کے باوجود 'ایک اہم اہم آدمی کی ہدایت پر ' دوسری قسط بھی اسی ارزاں قیمت پر فروخت کرنے کا ٹھیکا خادم علی شاہ اینڈ کو کی معرفت سوئٹزرلینڈ کے یونین بنک کو دے دیا گیا۔ بہت شور و غل کے بعد مجبور ہو کر یہ فیصلہ واپس لینا پڑا۔

قومی بنکوں اور مالیاتی اداروں کے سربراہ بدل کر ' ان کے ذریعہ جس طرح قومی دولت لوٹی جا رہی ہے ' وہ اس داستان کا ایک اور المناک باب ہے۔ میاں نواز شریف کے خلاف بڑے بڑے الزامات میں

سے یہ بھی تھا کہ انھوں نے منشا گروپ کی آڑ میں مسلم کمرشل بنک پر قبضہ کر لیا ہے' لیکن اب منشا گروپ سے حکومت کی خوب گاڑھی چھن رہی ہے۔

اخباری اطلاع کے مطابق ' توکل گروپ نے قومی بنکوں سے ۲۵۰ کروڑ روپے دھوکہ دہی سے ہتھیا لیے ہیں۔ عین اس وقت جب میاں محمد شریف اور چودھری شجاعت حسین کو دھوکہ دہی اور عدم ادائیگی کے الزام میں گرفتار کیا جا رہا تھا' پیپلز پارٹی کا اہم اہم آدمی بنکوں کو ہدایت کر رہا تھا کہ توکل گروپ کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ اس دھوکہ دہی میں یونائیٹڈ بنک کے ۱۱۰ کروڑ' نیشنل بنک کے ۶۴ کروڑ' مسلم کمرشل بینک کے ۲۲۶ کروڑ اور این ڈی ایف سی کے ۶۷ کروڑ ڈوب گئے ہیں۔

احتساب کی ساری کارروائی صرف سیاسی انتقام کی کارروائی ہے' اور ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے۔ کسی عام آدمی کو اس میں کوئی شک نہیں کہ بیوروکریٹ ہو یا جنرل' سیاست دان ہو یا تاجر' کوئی مجرم ہرگز سزا نہیں پائے گا۔ بنکوں کے نادہندگان کے خلاف کبھی کوئی کارروائی کیوں نہیں ہوتی؟ اس لیے کہ نادہندگان میں اپنوں کے چہرے بھی ہیں۔ میاں نواز شریف کے خلاف پلاٹوں کی اندھادھند تقسیم کے الزام میں (جو غلط بھی نہیں) کیوں کارروائی نہیں ہوگی؟ اس لیے کہ اس میں وہ بھی ملوث ہیں جو آج ادھر ہیں' اور یہ ناجائز تقسیم آج بھی جاری ہے۔ مہران بنک کے اسکینڈل پر اتنا شوروغوغا ہوا کہ ہوائی لہریں بوجھل ہو گئیں اور اخبارات کے کالم کے کالم سیاہ ہو گئے۔ آج اس کا ذکر بھی سننے میں نہیں آتا' کیوں؟ اس لیے کہ جو آج حکمران ہیں' وہ بھی گلے گلے اس میں غرق ہیں۔ حکومت نے ۵۰۰ کروڑ خورد برد کرنے کے باوجود' یونس حبیب سے ایک خفیہ معاہدہ کر لیا ہے کہ وہ جوڈیشل کمیشن کے سامنے بیان میں حکومت کے کسی فرد کو ملوث نہیں کریں گے اور حکومت ان کے خلاف وہ ۱۲۴ مقدمے نہیں کرے گی جن کے لیے اس کے پاس ثبوت موجود ہیں۔

سرحد میں ہارس ٹریڈنگ کے ذریعہ صابر شاہ حکومت کو ختم کرنے کے لیے مہران بنک نے جو فنڈ فراہم کیے ' ان کے بارہ میں میاں نواز شریف کے جاری کردہ ٹیپ صحیح ہیں' یہ رائے بہت سے باخبر لوگ دے چکے ہیں۔ لندن میں بیٹھے ہوئے' مہران بنک کے سابق ایگزیکٹو ڈائرکٹر حمید اصغر قدوائی کے پاس جو اس آپریشن کے انچارج تھے ' اکاؤنٹ نمبر' چیک نمبر' تاریخ اور طریق ادائیگی کا مکمل ریکارڈ موجود ہے ' جو وہ جوڈیشل کمیشن کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق دس کروڑ سے زائد رقم کی یہ ادائیگیاں آفتاب شیرپاؤ اور انور سیف اللہ کو ۲۲ نومبر ۱۹۹۳ کو شروع ہوئیں اور فروری / مارچ تک جاری رہیں۔ اس کے معاوضہ میں پاکستان اسٹیٹ آئل سے پانچ کروڑ' الائیڈ بنک سے دس کروڑ' واپڈا

سے ساڑھے سترہ کروڑ اور کراچی میونسپل کارپوریشن سے دس کروڑ روپے کی رقوم مہران بنک میں ڈیپازٹ کرائی گئیں (تین فی صد کمیشن کے مطالبہ کے ساتھ) 'اسٹیٹ بنک سے معاملات درست کرائے گئے اور مہران بنک کو خریدنے کی بات چیت مکمل ہوئی۔ پبلک اداروں کی ۲۴ کروڑ کی یہ رقم اب واپس ملنے کا کوئی امکان نہیں۔

یہ وہی سیف اللہ ' غلام اسحق خان کے داماد ' ہیں جن کے خلاف خود پیپلز پارٹی نے اپنے ''پاکستان کی لوٹ مار'' نامی کتابچہ میں لکھا تھا: ''ان کی سیاسی موقع پرستی کی کوئی نظیر نہیں۔ یہ ہر حکومت کے وفادار رہے ہیں - اور اس وفاداری کے صلہ میں امیر سے امیر تر ہوتے رہے ہیں''۔ جو نواز شریف حکومت کے رکن رکین تھے ' آج وہی بے نظیر حکومت کے ستون ہیں ' اور وہ جو کل ان کے خلاف دنیا بھر میں پروپیگنڈا کر رہی تھیں آج وہی ان کی پاک دامنی کی قسم کھانے کو تیار ہیں۔

آج کے حکمران اگر یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ جس طرح حکومت چلا رہے ہیں اس طرح حکومت کچھ زیادہ عرصہ چل سکتی ہے ' تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اور اگر وہ حقیقت حال سے آگاہ ہیں ' تو جان بوجھ کر خودکشی کر رہے ہیں۔ سیاسی استحکام ' صرف ملک کے نہیں ' خود ان کے مفاد میں بھی تھا۔ لیکن انھوں نے محاذ آرائی کے جواب میں زیادہ جارحانہ محاذ آرائی کی روش اختیار کر لی ہے۔ احتساب کے نام پر وہ سیاسی انتقام لینے پر اتر آئے ہیں ' اور میاں محمد شریف اور چودھری شجاعت کی گرفتاریوں جیسی انتہائی بچگانہ اور احمقانہ کارروائیاں کر رہے ہیں۔ اس طرح استحکام کی کوئی راہ کھل بھی سکتی تھی تو وہ مسدود ہو گئی ہے۔

سیاسی نظام میں اعلیٰ ترین ادارے قومی اسمبلی اور سینیٹ ہیں۔ انھیں باہمی جنگ و جدل کا اکھاڑا بنا دینے میں اپوزیشن کا رول بھی کم قابل مذمت نہیں ' لیکن ان کے احترام سے تو حکومت کا احترام ' اور ان کی بقا سے حکومت کی بقا وابستہ ہے۔ مگر نہ حکومت کے وزرا اجلاس میں آتے ہیں نہ ممبرانؑ اور نہ پالیسیوں اور قانون سازی پر بحثوں کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ اور اب اسمبلی کے اسپیکر (جو پیپلز پارٹی ہی کے ہیں) اور سینیٹ کے چیرمین کی رولنگ کے خلاف ''میں نہ مانوں'' کی روش ایک ایسی تباہ کن صورت حال کی طرف لے جا رہی ہے جس کا کوئی اندازہ شاید حکمرانوں کو نہیں ہے۔

عدلیہ پر ہر حکومت نے وار کیا ہے ' لیکن اب موجودہ حکومت کی کارروائیوں نے اس کی عزت اور آزادی پر لوگوں کا اعتماد خاک میں ملا دیا ہے۔ ناپسندیدہ جج اور چیف جسٹس من مانے طریقوں سے ہٹا دیے گئے ہیں۔ انھیں شریعت کورٹ پہنچا کر بیکار محض بنا دیا گیا ہے۔ اپنی پسند اور مرضی کے جج اور چیف

جسٹس مقرر کیے گئے ہیں' جو مقرر ہوئے ہیں ان میں سے اکثر کی شہرت نااہلی کی ہے۔

حکومتی ذرائع ابلاغ ہمیشہ حکومتوں کے پروپیگنڈے کے لیے وقف رہے ہیں۔ آج بھی وہ قانون' انصاف اور اخلاق کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر پہلے سے کچھ زیادہ ہی حکمرانوں کے نقطہ نظر کی پروجیکشن میں مشغول ہیں۔ لیکن ان کی ساکھ اب بھی صفر ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ان کو اسلامی تعلیمات و اقدار اور ثقافت کا مذاق اڑانے' ان کو ختم کرنے' اور ان کے خلاف رائے عامہ بنانے کے لیے بھی پورے دھڑلے سے استعمال کیا جارہا ہے۔

کشمیر پاکستان کے لیے رگ جان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر وزیراعظم بول تو خوب رہی ہیں' لیکن کارکردگی پہلے کی طرح صفر یا منفی ہے۔ پہلے جنیوا میں قرارداد پیش کرنے کا تماشا افسوسناک انداز میں ختم ہوا۔ اب اقوام متحدہ میں بھی یہی انجام ہوا۔ جس قرارداد کو او آئی سی کے بیشتر ممالک کی تائید حاصل تھی' وہ راتوں رات صرف امریکی دباؤ کے تحت واپس لے لی گئی۔ اس کا اعتراف حامد ناصر چٹھہ صاحب نے بھی کیا ہے۔ سابق وزیراعظم بھی تیسرے آپشن کی بات کر رہے تھے' اور کیمپ بند کر رہے تھے۔ موجودہ وزیراعظم اسی راہ پر آگے بڑھتی جارہی ہیں۔ ان کی نگاہیں ان امریکی ڈالروں ہی سے چکاچوند ہو رہی ہیں' جن کا ابھی دور دور پتا نہیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کشمیر کا امریکی حل قبول کرلیں' جس کے تحت موجودہ کنٹرول لائن ہی سرحد بن جائے' یا بہت سے بہت شاید وادی کشمیر کو کچھ نیم خود مختار یا خود مختار حیثیت مل جائے۔ غزہ اور ویسٹ بنک میں ۱۹۱۹ کی لارڈ چمس فورڈ کی اصلاحات کے طرز پر آزاد میونسپل حکومت کا ماڈل سامنے موجود ہے ہی۔

وزیراعظم ایک سال کی مختصر مدت میں ۲۱ سے زیادہ بیرونی دورے کر چکی ہیں۔ کامیابی کے دل خوش کن ڈھنڈورے پیٹے جاتے ہیں۔ لیکن کسی قومی معاملہ پر' خصوصاً کشمیر پر' ہمارے تجارتی مفادات پر' ہماری حمایت اور پذیرائی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ہم اسی طرح تنہا ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ دوڑی دوڑی ہر ملک پہنچ جاتی ہیں' ایسے ملکوں میں بھی جہاں ہمارا کوئی سفارت خانہ تک نہیں۔ لیکن اس پورے عرصہ میں قازقستان کے صدر کے علاوہ کوئی سربراہ پاکستان نہیں آیا۔ ہاں' ڈالر کے وعدوں کا سیلاب ضرور آیا ہے۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ اربوں ڈالر کے سبز باغ کیوں دکھائے جارہے ہیں؟ ایک حد تک موجودہ حکومت کو سہارا دینے کے لیے' لیکن اس سے بڑھ کر ایٹمی صلاحیت کے لیے جواز ختم کرنے کے لیے۔ اگر یہ صلاحیت پرامن مقاصد اور بجلی کے لیے ہی مطلوب ہے' جیسا پاکستان کا دعویٰ ہے' تو اس کا انتظام تو کر دیا گیا ہے' پھر اس کی کیا ضرورت رہ گئی! نئے نیوکلیر عدم توسیعی معاہدہ میں صرف ہندوستان

اور اسرائیل کو استثنا دیا جائے گا' اور پاکستان کے سینہ پر پستول رکھ کر دستخط کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ جو حکومت اپنے اقتدار کی بقا کے لیے خود کو امریکا کا محتاج سمجھے گی — اور موجودہ حکومت ایسا ہی سمجھتی ہے — پورا خدشہ ہے کہ وہ اس پستول کے آگے ہتھیار ڈال دے گی۔

ایک طرف کشمیر اور ایٹمی صلاحیت جیسے اہم قومی مفادات کے سر پر مہیب خطرات منڈلا رہے ہیں' دوسری طرف کراچی کی انتہائی مخدوش اور الم ناک کیفیت ملک کی روح اور مستقبل پر جو سائے ڈال رہی ہے وہ روز بروز تاریک سے تاریک ہوتے جارہے ہیں۔ آزاد کراچی کی باتیں فضا میں بہت پھیلی ہوئی ہیں' لیکن ہمارے خیال میں فی الحال اس کا کوئی خاص امکان نہیں۔ یہ چرچا شاید قوم کو نفسیاتی دہشت میں مبتلا رکھنے کے لیے کیا جارہا ہے' تاکہ اس کا دل اور پاؤں جمنے نہ پائیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کراچی کو طویل عرصہ تک 'بیروت کی طرح باہم خون ریزی' اقتصادی و معاشرتی بدحالی کا شکار رکھ کے' غیر مستحکم رکھنے کی کوشش کی جاتی رہے گی۔ کیونکہ کراچی پاکستان کا بھی دروازہ ہے' اور وسط ایشیا کا بھی۔

کراچی میں یہی صورت حال برقرار رہی تو حکومت کا برقرار رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ لیکن اس کی بے حسی اور سنگ دلی — یا شاید حکمت عملی — وزیر تجارت جناب احمد مختار کے اس جملہ سے عیاں ہے کہ "یہ ایک کمیونٹی کے دو گروہوں کے درمیان لڑائی ہو رہی ہے۔ لڑتے لڑتے تھک جائیں گے تو خود ہی صلح کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔"

فوجی آپریشن کے بارہ میں ہم نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا (اشارات، جولائی ۹۲) بدقسمتی سے وہ سب صحیح ثابت ہوئے ہیں۔ کراچی اور فوج کے درمیان ایک خطرناک خلیج پیدا ہو گئی ہے' کراچی کا امن و امان تہہ و بالا ہو گیا ہے۔ کسی کی جان محفوظ نہیں' لوگ جان کے ڈر سے گھروں سے باہر نہیں نکلتے' شہر میں طوائف الملوکی کی کیفیت ہے' مختلف علاقوں میں مختلف گروہوں کے کلاشن کوف بردار نوجوانوں کی حکومت ہے۔ کیونکہ فوجی آپریشن ابھی جاری ہے اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب فوج کی اجازت کے بغیر ہو رہا ہے؟ یا فوج بے بس ہے؟ یا اس صورت حال کو حکومت کی رضامندی حاصل ہے؟

موجودہ صورت حال کا سب سے زیادہ تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ کوئی سنگین مسئلہ بظاہر حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ تجزیے بھی صحیح ہوتے ہیں' حل بھی موجود ہیں' اور برابر تجویز بھی کیے جارہے ہیں' لیکن مسئلہ حل ہوتا تو اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ایکٹر اپنا رول اور روش بدلنے کو تیار ہوں۔ جن کو بدلنا چاہیے اگر وہ نہیں بدلتے' تو صرف وعظ و نصیحت اور نیک تمناؤں اور امیدوں سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ یہی سنت الہی ہے' اسی پر تاریخ گواہ ہے۔ ان کے بدلنے کا امکان نظر نہیں آتا۔

اگر حزب اقتدار اور حزب اختلاف ایک دوسرے کو تسلیم کرنے کے بجائے باہم بر سرپیکار رہیں ' تو کوئی نظام بھی نہیں چل سکتا۔ لیکن بے نظیر ہوں یا نواز شریف ' جو اقتدار سے باہر ہو وہ دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ جو برسراقتدار ہو وہ دوسرے کو کچل کے ختم بھی نہیں کر سکتا ' نہ اس کی مسلسل مزاحمت کے ساتھ حکومت چلا سکتا۔ دونوں کے سامنے وعظ کہا جا رہا ہے ' مگر روش یہ ہو تو سیاسی تفرقہ بازی اور پولرائزیشن کیسے ختم ہو ' اور حکومت کیسے چلے؟ کراچی میں بھی جنگ و جدل میں مصروف گروہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر ' اپنی انا اور ناجائز مطالبات ترک کر کے ' کوئی متفقہ حل نکالنے کو تیار نہ ہوں ' تو کاغذی حل سے بہتری کیسے ہو سکتی ہے۔

موجودہ حکومت کو ہٹانے میں کامیابی کا بھی کوئی امکان فی الحال نظر نہیں آتا۔ ایوان کے اندر تبدیلی تو اس وقت بھی ممکن نہ ہوئی جب صدر اور چیف آف اسٹاف دونوں میاں نواز شریف کی پشت پناہی کر رہے تھے ' پھر آج کیسے ہو جائے گی جبکہ صدر پیپلز پارٹی کا ہے اور چیف آف اسٹاف عدم مداخلت اور غیر جانبداری کا دعویدار۔ ایوان کے باہر عوام کو اس طرح اور اتنی تعداد میں کھڑا کر دینا کہ حکومت کو جاتے ہی بن پڑے ' نہ اب تک ممکن ہوا ہے نہ آیندہ ممکن نظر آتا ہے۔ ۱۹۶۹ اور ۱۹۷۷ میں بھی تبدیلی ' زبردست عوامی احتجاجی تحریکوں کی وجہ سے نہیں ' بلکہ اس لیے ممکن ہوئی کہ حکمران خود چلا گیا ' یا اس کو فوج نے ہٹا دیا۔

موجودہ حکومت ہٹا کر انھی اسمبلیوں یا نئے انتخابات کے ذریعہ کوئی دوسری حکومت آبھی جائے ' تو دور دور اس کا امکان نظر نہیں آتا کہ کوئی نمایاں بہتری پیدا ہوگی۔ وہی چہرے ہوں گے۔

سچی بات یہ ہے کہ ملک میں آج تک کوئی تبدیلی فوج کے بغیر نہیں ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۸ ' ۱۹۹۰ اور ۱۹۹۳ میں بھی ' انتخابات کے باوجود ' یہ فوج کا رول تھا جو تبدیلی کا باعث بنا۔ اسی لیے سیاست دان اور دانش ور تیسری قوت کے آجانے سے خبردار کر رہے ہیں ' اور بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ وہی مسئلہ کا حل ہے کیونکہ جمہوریت ناکام ہو چکی ہے۔ پاکستان میں مارشل لا کے امکان کو کسی وقت بھی مسترد تو نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اندرونی اور بیرونی صورت حال کو دیکھتے ہوئے ' فوج کے لیے براہ راست عنان حکومت سنبھال لینا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ سنبھال بھی لے ' تو عارضی طور پر حالات پر سکون کر دینے کے علاوہ وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ پاکستان میں جمہوریت ہی ناکام نظر نہیں آتی ' مارشل لا اور شخصی آمریت کے تجربے بھی ناکام ہو چکے ہیں۔ کراچی میں فوجی آپریشن ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ فوج مسائل کو حل کرنے کی کتنی صلاحیت رکھتی ہے۔

جو لوگ مسائل پیدا کر رہے ہیں ' وہ انھیں حل کرنا چاہتے ہوں ' اور اپنی من مانی کرنے اور قومی

دولت کو لوٹنے کے بجائے باہمی مشورہ اور امانت و دیانت اور عدل کے ساتھ کاروبار حکومت چلانا چاہتے ہوں' تو وہ مل بیٹھ کر موجودہ مسائل کا قابل اطمینان حل تلاش کر سکتے ہیں۔

حکمرانوں کو عدالتوں کے سامنے جواب دہ بنایا جا سکتا ہے۔ احتساب کے لیے بااختیار عدالتیں بنائی جا سکتی ہیں' جن کے پاس صرف حکومتیں ہی نہیں کوئی بھی شہری بمع ثبوت ریفرنس فائل کر سکتا ہو' جو خود اپنے طور پر کارروائی شروع کرنے کی مجاز ہوں' جن کو ہر ریکارڈ اور ہر معلومات حاصل کرنے کا اختیار ہو جو بشمول صدر اور وزیراعظم کسی بھی ریاستی عہدیدار کو طلب کر سکیں' جن کا طریق اسلامی اصولوں کے مطابق سادا اور سستا ہو تاکہ طویل اور گراں قیمت عدالتی کارروائیوں سے نجات ملے' جنھیں ناجائز دولت ضبط کرنے کا بھی اختیار ہو۔ بڑے بڑے اقتصادی سودوں' منصوبوں اور زمینوں کی داد و دہش جیسے معاملات کو کسی خصوصی اقتصادی عدالت کے سامنے چیلنج کیے جانے کا انتظام ہو سکتا ہے۔ اسی طرح حساس قومی امور پر فیصلے بھی مثلاً کشمیر' ایٹمی صلاحیت' بیرونی سرمایہ کاری کے بڑے بڑے معاہدے --- کسی ایسی ہی کمیٹی کے سپرد کیے جا سکتے ہیں۔

تجاویز برابر آ رہی ہیں' ہم بھی تجویز دے سکتے ہیں۔ ہر تجویز کی زد کسی گروہ کے مفاد پر پڑے گی۔ اس لیے جب تک مقتدر سیاسی قوتیں خود حل تلاش کرنے میں مخلص نہ ہوں' تجاویز سے کچھ نہیں بنے گا' مگر ان کا حال یہ ہے کہ "ہر گروہ اپنے موقف اور روش پر اٹل اور اسی میں مگن ہے' كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ" اور "ہر ایک اپنے برے اعمال کے پیچھے دل و جان سے لگا ہوا ہے' اس کو وہی اچھے نظر آتے ہیں اور باقی سب غلط' اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا" اس لیے کہ ان کے سامنے صرف اپنی خواہشات ہیں' وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ۔

صحیح بات یہ ہے کہ اگر بحر و بر میں فساد لوگوں کے اعمال بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ کی وجہ سے ہے --- اور یقیناً ہے کہ اللہ کی بات سے سچی کس کی بات ہو سکتی ہے --- تو یہ فساد اس کے سوا اور کس طرح دور ہو سکتا ہے کہ لوگ اپنے اعمال بدلیں' یا ان کو اٹھا کر پھینک دیا جائے اور ان کی جگہ نئے لوگ لائے جائیں۔

حالات سنگین اور تلخ ضرور ہیں' لیکن مایوسی کفر ہے' اور لوگ کشتی میں چھید کر رہے ہوں تو پوری تندہی سے کشتی کو بچانے میں لگ جانا سب سے اہم اور مقدس فریضہ۔ کچھ بھی نہ کر سکیں تو کم سے کم' بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی طرح' مرثیے پڑھنے' رہنماؤں اور قوم کو جھنجھوڑنے اور جگانے' ان کے کانوں میں صور پھونکنے' اور ان کو سر پر منڈلاتے ہوئے مہیب خطرات سے آگاہ اور خبردار کرنے کا کام تو کرنا ہی چاہیے۔

لوگوں نے مشہور بزرگ حضرت ابراہیم ادھم بلخی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے ہم دعا کرتے ہیں اور قبول نہیں ہوتی۔
آپ نے جواباً فرمایا کہ دس چیزوں کی وجہ سے تمہارے دل مردہ ہو گئے ہیں

۱۔ تم نے خدا کو پہچانا مگر اس کا حق ادا نہ کیا۔
۲۔ خدا کی کتاب پڑھی مگر اس پر عمل نہ کیا
۳۔ ابلیس، شیطان سے دشمنی کا دعویٰ کیا مگر اس کے ساتھ دوستی قائم رکھی۔
۴۔ محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تم نے دعویٰ کیا مگر آپ ؐ کے طریقے اور سنت کو چھوڑ دیا۔
۵۔ جنت میں جانے کی خواہش کی لیکن اس کے لیے اچھے عمل نہیں کیے۔
۶۔ دوزخ سے خوف کا دعویٰ کیا مگر گناہوں سے باز نہ رہے۔
۷۔ موت کے حق ہونے کا بھی اعلان کرتے رہے مگر اپنے عیوب پر کبھی نظر نہ ڈالی۔
۸۔ لوگوں کے عیب گنتے رہے مگر اپنے عیوب پر کبھی نظر نہ ڈالی۔
۹۔ خدا کا دیا ہوا رزق کھاتے رہے مگر اس کی شکر گزاری نہ کی۔
۱۰۔ روز اپنی میتوں کو دفن کرتے رہے مگر ان کے احوال سے عبرت حاصل نہ کی۔

پس ان حالات میں تمہاری دعا کیسے قبول ہوتی۔

(بندۂ خدا)

۶۰ سال پہلے

جس قوم میں منافقت اور ضعف اعتقاد کا مرض عام ہو جائے، جس قوم میں فرض کا احساس باقی نہ رہے، جس قوم سے سمع و اطاعت اور ضابطہ کی پابندی اٹھ جائے، اس کا جو کچھ انجام ہونا چاہئے ٹھیک وہی انجام مسلمانوں کا ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ آج مسلمان تمام دنیا میں محکوم و مغلوب ہیں۔ جہاں ان کی اپنی حکومت موجود ہے وہاں بھی وہ غیروں کے اخلاقی، ذہنی اور مادی تسلط سے آزاد نہیں ہیں۔ جہالت، مفلسی اور خستہ حالی میں وہ ضرب المثل ہیں۔ اخلاقی پستی نے ان کو حد درجہ ذلیل کر دیا ہے۔ امانت، صداقت اور وفائے عہد کی صفات جن کے لئے وہ کبھی دنیا میں ممتاز تھے، اب ان سے دوسروں کی طرف منتقل ہو چکی ہیں، اور ان کی جگہ خیانت، جھوٹ، دغا اور بدمعاملگی نے لے لی ہے۔ تقویٰ، پرہیزگاری اور پاکیزگی اخلاق سے وہ عاری ہوتے جاتے ہیں، قومی غیرت و حمیت روز بروز ان سے مفقود ہوتی جاتی ہے، کسی قسم کا نظم ان میں باقی نہیں رہا ہے۔ آپس میں ان کے دل پھٹتے چلے جاتے ہیں اور کسی مشترک غرض کے لئے مل کر کام کرنے کی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہتی ہے۔ وہ غیروں کی نگاہوں میں ذلیل ہو گئے ہیں، ان کا قوموں پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے اور اٹھتا جا رہا ہے، ان کی قومی طاقت اور اجتماعی قوت کمزور ہوتی جا رہی ہے، ان کی قومی تہذیب و شائستگی فنا ہوتی چلی جا رہی ہے اور اپنے حقوق کی مدافعت اور اپنے شرف قومی کی حفاظت سے وہ عاجز ہوتے جا رہے ہیں۔ باوجودیکہ تعلیم ان میں بڑھ رہی ہے، گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ اور یورپ کے تعلیم یافتہ حضرات کا اضافہ ہو رہا ہے، بنگلوں میں رہنے والے، موٹروں پر چڑھنے والے، سوٹ پہننے والے، بڑے بڑے ناموں سے یاد کئے جانے والے، ان میں روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں، لیکن جن اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے وہ پہلے متصف تھے، اب ان سے عاری ہیں، اپنی ہمسایہ قوموں پر ان کی جو ساکھ اور دھاک پہلے تھی وہ اب نہیں ہے، جو عزت وہ پہلے رکھتے تھے وہ اب نہیں رکھتے، جو اجتماعی قوت و طاقت ان میں پہلے تھی وہ اب نہیں ہے۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، جلد ۵، عدد ۳، رمضان المبارک ۱۳۵۳، جنوری ۱۹۳۵)

ادارہ معارف اسلامی کی نئی کتب

آفاقِ دعوت

☆ آفاقی دعوت آفاق تک کیسے پہنچی؟

☆ مولانا خلیل احمد کا منفرد سفرنامہ اس سوال کا احاطہ کرتا ہے۔

☆ دس ممالک کے سفر کے دلچسپ مشاہدات و تاثرات۔

☆ بوسنیا، البانیہ اور بلغاریہ کے مسلمانوں کی حالت زار اور ان کے جذبہ ایمانی کی سرگذشت۔

☆ سوئٹزرلینڈ، انگلستان اور سنگاپور میں دعوت اسلامی کے نئے افق۔

☆ ملائیشیا اور سوڈان میں انقلابی تبدیلیوں کا تذکرہ۔

صفحات ۳۸۴ کمپیوٹر کمپوزنگ مجلد اعلیٰ معیار طباعت قیمت/۱۰۰ روپے

جدید نظریات کی شکست اور اسلامی نظام کی ضرورت

☆ الجزائر کی تحریک اسلامی، اسلامک سالویشن فرنٹ کے صدر ڈاکٹر عباسی مدنی کے قلم سے جدید نظریات کا بے لاگ تجزیہ!

☆ عصری فکر کے بحران کا گہرا مطالعہ اور اس کا حل۔

☆ شمالی افریقہ کے درویش صفت رہنما کے مجاہدانہ قلم سے امپیریلزم، کمیونزم اور لبرلزم پر ضرب کاری۔

☆ مولانا خلیل احمد حامدی نے اردو ترجمہ کے ساتھ ساتھ الجزائر کی تحریک جہاد کو (امیر عبدالقادر الجزائری سے عباسی مدنی تک) کو دیباچہ میں سمو دیا ہے۔

صفحات ۲۰۸، کمپیوٹر کمپوزنگ، خوبصورت ٹائٹل اور معیاری طباعت، قیمت ۶۰ روپے۔

ملنے کا پتہ۔

المنار بک سنٹر، منصورہ ملتان روڈ لاہور پوسٹ کوڈ 54570

فون: 7830033۔448022

حکمت عملی کے اصول

آئیڈیلزم اور حکمت عملی

ہم اپنی تحریک خلا میں نہیں چلا رہے ہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں چلا رہے ہیں۔ اگر ہمارا مقصد محض اعلان و اظہار حق ہوتا تو ہم ضرور صرف بے لاگ حق بات کہنے پر اکتفا کرتے۔ لیکن ہمیں چونکہ حق کو قائم بھی کرنے کی کوشش کرنی ہے اور اس کی اقامت کے لیے اسی واقعات کی دنیا میں سے راستہ نکالنا ہے' اس لیے ہمیں نظریات اور حکمت عملی کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے چلنا پڑتا ہے۔

آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے آخری مقصود کو نہ صرف خود پیش نظر رکھیں بلکہ دنیا کو بھی اس کی طرف بلاتے اور رغبت دلاتے رہیں اور حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے مقصود کی طرف بتدریج بڑھیں اور واقعات کی دنیا میں ہم کو جن حالات سے سابقہ ہے ان کو اپنے مقصد کی طرف موڑنے' اس کے لیے مفید بنانے اور مزاحمتوں کو ہٹانے کی کوشش کرتے رہیں۔ (رسائل و مسائل، ج ۴' ص ۵۔۳۲۲-۳)

تبدیلی، جمود اور زائد از شریعت پابندیاں

میرے نزدیک کوئی گروہ' اسی زمانے میں نہیں کسی زمانے میں بھی نہیں' جاہلیت سے لڑکر اسلامی نظام زندگی قائم کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا' جب تک کہ وہ تجربات سے سبق سیکھ کر' اور حالات کو سمجھ کر' اپنی پالیسیوں میں ایسا ردوبدل نہ کرتا رہے جس کی حدود شرع کے اندر گنجائش ہو۔ آپ کو اگر فی الواقع یہ کام کرنا ہے اور صرف تبلیغ کا فرض انجام دے کر نہیں رہ جانا ہے تو اپنے اوپر ان پابندیوں کو کافی سمجھیے جو خدا اور رسول ﷺ کی شریعت نے آپ پر عائد کی ہیں اور اپنی طرف سے کچھ زائد پابندیاں عائد نہ کرلیجیے۔ شریعت پالیسی کے جن تغیرات کی وسعت عطا کرتی ہو' اور عملی ضروریات جن کی متقاضی بھی ہوں' ان سے صرف اس بنا پر اجتناب کرنا کہ پہلے ہم اس سے مختلف کوئی پالیسی بنا چکے ہیں' ایک بے جا جمود ہے۔ اس جمود کو اختیار کر کے آپ "اصول پرستی" کا فخر کرنا چاہیں تو کرلیں' مگر یہ حصول مقصد کی راہ میں چٹان بن کر کھڑا ہو جائے گا۔ اور اس چٹان کو کھڑا کرنے کے لیے آپ خود ذمہ دار ہوں گے' کیونکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اسے کھڑا نہیں کیا ہے۔ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۲۲۶-۲۲۵)

اصول و مقصد اور حالات کے تقاضے

"پاکستان کے موجودہ حالات میں 'عوام کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے'' ہماری سیاسی پالیسی کیا ہونی چاہیے' میں اس کا ایک اصولی جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ ہمارے رفقا کسی غلط طرز فکر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم جس ملک میں' جس قوم میں' جس زمانے میں اور جن حالات میں کام کر رہے ہیں' ہمیں کوئی پروگرام بناتے ہوئے ان سب کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ لیکن ہماری دعوت لازماً ایک ہی رہے گی' ہمارا ابنیادی مقصد بھی قطعاً ناقابل تغیر ہو گا' اور اپنا عملی پروگرام بناتے ہوئے ہم ان چیزوں کو صرف اس حیثیت سے ملحوظ رکھیں گے کہ اس ملک میں' اس زمانے کے حالات میں' ہم اپنی دعوت کو کس طریقے سے فروغ دیں' اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس قوم کے اچھے رجحانات سے کس طرح فائدہ اٹھائیں' اور اس کے برے رجحانات کو کس طرح بدلیں کہ وہ ہمارے مقصد کی راہ میں کم از کم رکاوٹ تو نہ بن سکیں۔ اس نقطہ نظر سے ان چیزوں کو ملحوظ رکھنا تو عین تقاضائے حکمت ہے' لیکن اگر ہم زمان و مکان کے حالات اور لوگوں کے رجحانات کو دیکھ کر اپنی دعوت اور اپنے مقصد ہی پر نظرثانی کرنے بیٹھ جائیں تو یہ سراسر گمراہی ہے جس کا خیال تک ہمارے ذہن میں نہ آنا چاہیے۔

طریق کار حالات کے لحاظ سے بدلا جاسکتا ہے۔ حکمت عملی میں لوگوں کے اچھے یا برے رجحانات کے لحاظ سے تغیر کیا جاسکتا ہے۔ مگر اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسلام اور اس کی دعوت کے جو اصول مقرر کر دیے ہیں' ان میں ذرہ برابر کوئی ردوبدل لوگوں کے رجحانات یا زمانے کے حالات کو دیکھ کر نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ اور اس کے رسول ؐ نے جس چیز کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے' ہمیں ہر حال میں اسی کو قائم کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم جس ملک میں کام کر رہے ہوں' اس کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم اس مقصد کے لیے سعی و جہد کے ایک طریقے کو موزوں پاکر اختیار کرلیں اور دوسرے طریقے کو ناموزوں سمجھ کر ترک کر دیں۔ اسی طرح جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول مٹانا چاہتے ہیں' ان کو مٹانا ہی ہماری کوششوں کا ہمیشہ مقصود رہے گا' یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی استطاعت اور ملک کے حالات اور عوام کی مزاجی کیفیات کو دیکھ کر یہ طے کریں کہ کن چیزوں کو مٹانے کی کوشش مقدم اور کن کے مٹانے کی کوشش موخر رکھی جانی چاہیے۔ نیز یہ کہ اس غرض کے لیے ہم کون سی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں اور کن تدابیر کا اختیار کرنا غیر ممکن' غیر مفید یا غیر مناسب ہے۔

(تصریحات، ص ۳۰۶-۳۱۶' اجتماع ارکان لاہور' ۱۹۵۷ء)

امت مسلمہ کی وسعت دامانی

ڈاکٹر حافظ احسان الحق

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ (فاطر ۳۵-۳۲)

پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنا دیا ان لوگوں کو جنھیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا۔ اب کوئی ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے' اور کوئی بیچ کی راس ہے' اور کوئی اللہ کے اذن سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے۔ یہی بہت بڑا فضل ہے۔

۱۔ ابن کثیر: حافظ عماد الدین اسماعیل ابن کثیرؒ

فرمایا: اس کتاب کو' یعنی قرآن عظیم کو' ہم نے اپنے ان بندوں کے' یعنی اس امت کے' ہاتھوں میں دیا جن کو ہم نے (اپنے پیغام کی وراثت اور اس کی امانت کا حامل بننے کے لیے) منتخب کر لیا۔ پھر ان میں تین قسم کے لوگ ہوگئے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ منتخب بندوں سے مراد امت محمدؐ ہے جو خدا کی ہر کتاب کی وارث بنائی گئی ہے۔ ان میں سے جو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں' انھیں بخشا جائے گا جو درمیانہ درجہ کے ہیں' ان سے آسان حساب لیا جائے گا' جو آگے بڑھ کر اور نیکیاں کرنے والے ہیں وہ بلا حساب جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔

اکثر سلف کا یہی قول ہے' لیکن بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ظلم کرنے والے نہ تو اس امت میں داخل ہیں' نہ وہ اللہ کے منتخب کردہ ہیں' نہ وہ وارثین کتاب ہیں۔ ابن عباسؓ کا ایک اور قول ہے کہ ظالم سے مراد کافر ہیں (ابن ابی حاتم)، مجاہدؒ نے کہا کہ یہ اصحاب مشئمہ ہیں' اور حسن بصریؒ و قتادہؒ سے مروی ہے کہ یہ منافق ہیں۔ گویا یہ تین قسمیں بندوں کی نہیں' سارے انسانوں کی ہیں' اور یہ وہی تین گروہ ہیں جن کا ذکر سورۃ الواقعہ میں کیا گیا ہے۔

لیکن صحیح قول یہی ہے کہ ظالم سے مراد اسی امت کا ایک گروہ ہے۔ یہی قول ابن جریرؒ (اور زمخشریؒ) نے اختیار کیا ہے۔ آیت کے الفاظ بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ امام احمدؒ نے ابو سعید الخدریؓ اور ابو الدرداءؓ سے طبرانی نے اسامہ بن زیدؓ سے اور ابن ابی حاتم نے عوف بن مالکؓ سے اسی مضمون کی احادیث روایت کی ہیں، جو ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: اس امت کے قیامت کے دن تین حصے ہو جائیں گے: ایک حصہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو گا، ایک سے آسان حساب لیا جائے گا، اور ایک بڑے بڑے گناہ لے کر آئے گا، مگر شرک نہ کیا ہو گا، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر انھوں نے یہی آیت پڑھی (ابن جریر)۔ حضرت عائشہؓ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: اے بیٹے، یہ سب جنتی ہیں۔ سابق بالخیرات وہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ وہ ہیں جنھوں نے آپ کے نقش قدم کی پیروی کی اور ظالم لنفسہ میرے تمھارے جیسے لوگ ہیں (ابو داؤد الطیالسی)۔

۲ - مفاتیح الغیب: فخر الدین رازی

مفسرین کی اکثریت کا اس پر اتفاق ہے کہ مذکورہ آیت میں "کتاب" سے مراد قرآن حکیم ہے، اور اصطفینا‌ھم (جنھیں ہم نے چنا) سے مراد اہل ایمان ہیں۔ ظلم کرنے والے، بیچ میں رہنے والے اور نیکیوں میں سبقت لے جانے والے اہل ایمان ہی کے گروہ ہیں۔ کتاب کے وارث بھی وہی لوگ ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور ان کی تعلیمات سے فیض یاب ہوئے، پھر ان سے گناہ سرزد ہوئے اور یوں وہ اپنے نفسوں پر ظلم کے مرتکب ہوئے۔ مقتصد وہ لوگ ہیں جنھوں نے کچھ نیک عمل کیے اور کچھ بدعمل کیے۔ اور "سابق" نیکیوں میں سبقت لے جانے والے، وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے عمل کو اللہ کے لیے خالص کیا اور اپنے آپ کو گناہوں سے دور رکھا۔ یہاں یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ ایک مومن، جسے اللہ نے اپنا چنیدہ بندہ کہا، اور کتاب کا وارث ٹھیرایا، وہ ظالم کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مومن معصیت کرتے وقت ایمان کے منافی حالت میں ہوتا ہے اور یہی ظلم ہے۔ اسی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا، کہ زانی جب زنا کرتا ہے اس وقت وہ مومن نہیں ہوتا۔ اسی طرح آدم علیہ السلام نے، جو مقام اصطفیٰت پر فائز تھے، شیطان کے بہکاوے میں آنے کے بعد دعا مانگی، تو فرمایا: ربنا ظلمنا انفسنا......... الخ۔

قرآنی اصطلاح میں مومن کے ظالم اور کافر کے ظالم ہونے میں فرق یہ ہے کہ کافر ارتکاب معصیت میں اپنے جسم کے ساتھ اپنے قلب کو بھی شریک کرتا ہے، جب کہ مومن کا قلب ایمان سے اطمینان پاتا

ہے۔ لہٰذا وہ ارتکاب معصیت کے باوجود اللہ کی محبت اور اس کے احسانات کے احساس سے سرشار رہتا ہے۔ ظالم (حد سے تجاوز کرنے والے)' مقتصد (درمیان میں رہنے والے) اور سابق (نیکیوں میں سبقت لے جانے والے)' تینوں کے بارے میں مفسرین کی آرا درج ذیل ہیں۔

۱۔ ظالم وہ ہے جس کا ظاہر اس کے باطن سے بہتر ہو' مقتصد وہ ہے جس کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہو' سابق وہ ہے جس کا باطن اس کے ظاہر سے اچھا ہو۔

۲۔ ظالم وہ ہے جو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو' مقتصد وہ ہے جو صغیرہ گناہ کرے' سابق وہ ہے جو ہر قسم کی معصیت سے پاک ہو۔ (ایسا کون ہو سکتا ہے!)

۳۔ ظالم وہ ہے جو قرآن بغیر سمجھے پڑھے اور اس کے تقاضے پورا نہ کرے' مقتصد وہ ہے جو قرآن سمجھ کر پڑھے' سابق وہ ہے جو قرآن کا عالم باعمل ہو۔

۴۔ ظالم جاہل ہے' مقتصد طالب علم ہے' اور سابق عالم ہے۔

۵۔ ظالم وہ ہے جو معاصی پر اصرار (بار بار) کرے' مقتصد وہ ہے جو نافرمانیوں پر شرمندہ ہو' اور توبہ کرے' اور سابق وہ ہے جس کی توبہ قبول کر لی جائے۔

۳۔ روح المعانی: محمود آلوسی

۱۔ ظالم وہ ہے جس کی تگ و دو دنیا کے لیے ہو' مقتصد وہ ہے جس کا مقصود آخرت ہو' اور سابق وہ ہے جس کا مقصود ذات الٰہی ہو۔

۲۔ ظالم وہ ہے جس کی مصروفیات اسے آخرت سے غافل کر دیں' مقتصد وہ ہے جو دنیا و آخرت دونوں کے لیے کوشاں رہے' سابق وہ ہے جسے فکر آخرت دنیا سے غافل کر دے۔

۳۔ ظالم وہ ہے جو منکر سے نہ روکے اور خود بھی اس سے باز نہ آئے' مقتصد وہ ہے جو منکر سے روکے اور خود اس کا مرتکب ہو' سابق وہ ہے جو معروف کا حکم دے اور اس پر عمل پیرا ہو۔

۴۔ ظالم حد اعتدال سے گزرنے والا' مقتصد عدل کرنے والا اور سابق احسان کرنے والا ہے۔

باذن اللہ اس لیے فرمایا کہ نیکی کا اعلیٰ مقام اور نفس کو اطاعت کے راستہ پر ڈالنے کا عظیم کام اللہ کی توفیق کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ظالم کا ذکر مقدم اس لیے کیا گیا کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' اور سابق کا ذکر موخر اس لیے کیا گیا کہ وہ اپنے اعمال پر نہ اترا ئے۔

۴- تدبر قرآن: مولانا امین احسن اصلاحی

یہ اس انتظام کا ذکر ہے جو اپنی ہدایت سے خلق کو بہرہ یاب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ الذین اصطفینا من عبادنا ' سے یہاں بنی اسماعیل یا بالفاظ دیگر امیین عرب، من حیث الجماعت مراد ہیں 'جن کے اندر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنے وہ آخری رسول بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا' جس کے ذریعے خلق کو آخری اور کامل شریعت ملنے والی تھی ... وارث بنایا کے الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس سے پہلے جو لوگ کتاب الٰہی کے وارث بنائے گئے تھے (یعنی بنی اسرائیل) سے یہ امانت چھینی اور ایک دوسرے گروہ' جس کو اس شرف کے لیے منتخب کیا (یعنی بنی اسماعیل) کو یہ امانت بخشی۔

(یہاں بنی اسماعیل میں سے) من حیث الافراد ان کا وہ رویہ بیان ہوا ہے جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس انعام کے جواب میں اختیار کیا۔ فرمایا کہ ان میں تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو اپنا ایڑی چوٹی کا زور اس کی مخالفت میں صرف کر رہے ہیں۔ نہ خود اس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں نہ کسی دوسرے ہی کو قبول کرنے دینا چاہتے ہیں ... اسی گروہ کو یہاں ظالم لنفسہ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی یہ اپنی اس مخالفت سے اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں کہ اپنے لیے خدا کے سب سے بڑے فضل سے محرومی اور جہنم کے عذاب کا سامان کر رہے ہیں۔ ورنہ جہاں تک خدا کے دین کا تعلق ہے اس کو ان کی مخالفت سے کوئی گزند پہنچنے والا نہیں ہے۔ لفظ ظلم سے قرآن مجید میں بالعموم شرک کو تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ الصافات میں ہے ومن ذریتھما محسن وظالم لنفسہ مبین ' اور ان دونوں (ابراہیم و اسحاق) کی ذریت میں نیکوکار بھی ہیں اور اپنی جانوں پر کھلا ظلم ڈھانے والے بھی۔

مفسرین نے عام طور پر الذین اصطفینا من عبادنا سے امت مسلمہ کو مراد لیا ہے' اور پھر اس سے یہ نتیجہ بھی معلوم نہیں کس طرح نکال لیا کہ یہ ظالمین بھی بخش دیے جائیں گے۔ ہم نے آیت کا صحیح موقع و محل معین کر دیا ہے۔ اس وجہ سے اس خیال کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہماری تائید میں حضرت ابن عباس ؓ اور مجاہد ؒ سے روایات بھی ہیں۔

ومنھم مقتصد 'یہ دوسرے گروہ کا ذکر ہے۔ مقتصد میانہ رو کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ مخالفت تو نہیں کرتے 'لیکن آگے بڑھ کر اس دعوت حق کی حمایت کا حوصلہ بھی نہیں کر رہے ہیں۔ ان کا مخالفت نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو اس دعوت کے حق ہونے کا احساس ہے 'لیکن یہ احساس اتنا قوی نہیں ہے کہ وہ تمام پیش و عقب سے بالکل بے پروا ہو کر اس کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ قرآن نے ان کے لیے یہ لفظ استعمال کر کے فی الجملہ ان کے متعلق یہ امید دلائی ہے کہ یہ لوگ 'پہلے گروہ

ظالم لنفسہ کی طرح اس نعمت سے محروم رہنے والے نہیں ہیں بلکہ دیر سویر ان کا تردد رفع ہو جائے گا اور اللہ نے چاہا تو یہ اس دعوت کے پر زور حامیوں میں سے بن جائیں گے۔

ومنہم سابق بالخیرات یہ تیسرے گروہ کا ذکر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر حق کا شعور اتنا قوی ہوتا ہے کہ ہر دعوت حق ان کو فوراً اپیل کرتی ہے' اور ان کی قوت ارادی اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ جب ان کو کوئی چیز اپیل کر لیتی ہے تو وہ اس کی خاطر راہ کے تمام عقبات ایک ہی جست میں پار کر جاتے ہیں' اور اس کی حمایت یا مدافعت میں کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے' بلکہ تمام رکاوٹوں کا پوری دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے نیکی اور بھلائی کے ہر میدان میں گوئے سبقت لے جانے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ یہ اشارہ اسلام کے سابقون الاولون کی طرف ہے' جن کے سرخیل سیدنا ابوبکر صدیق ؓ تھے۔

۵۔تفہیم القرآن۔ سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

یہ مسلمان سب کے سب ایک ہی طرح کے نہیں ہیں بلکہ یہ تین طبقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔

۱۔ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سچے دل سے اللہ کی کتاب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمانداری کے ساتھ اللہ کا رسول تو مانتے ہیں' مگر عملاً کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی پیروی کا حق ادا نہیں کرتے۔ مومن ہیں' مگر گناہ گار ہیں۔ مجرم ہیں' مگر باغی نہیں ہیں۔ ضعیف الایمان ہیں مگر منافق اور دل و دماغ سے کافر نہیں ہیں۔ اسی لیے ان کو ظالم لنفسہ ہونے کے باوجود وارثین کتاب میں داخل اور خدا کے چنے ہوئے بندوں میں شامل کیا گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ باغیوں اور منافقوں اور قلب و ذہن کے کافروں پر ان اوصاف کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ تینوں درجات میں سے اس درجہ کے اہل ایمان کا ذکر سب سے پہلے اس لیے کیا گیا ہے کہ تعداد کے لحاظ سے امت میں کثرت ان ہی کی ہے۔

۲۔ بیچ کی راس' یہ وہ لوگ ہیں جو اس وراثت کا حق کم و بیش ادا تو کرتے ہیں مگر پوری طرح نہیں کرتے۔ فرماں بردار بھی ہیں اور خطاکار بھی۔ اپنے نفس کو بالکل بے لگام تو انھوں نے نہیں چھوڑ دیا ہے' بلکہ اسے خدا کا مطیع بنانے کی اپنی حد تک کوشش کرتے ہیں' لیکن کبھی یہ اس کی باگیں ڈھیلی بھی چھوڑ دیتے ہیں اور گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی اچھے اور برے دونوں طرح کے اعمال کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ یہ تعداد میں پہلے گروہ سے کم اور تیسرے گروہ سے زیادہ ہیں۔ اس لیے ان کو دوسرے نمبر پر رکھا گیا ہے۔

۳۔ نیکیوں میں سبقت کرنے والے' یہ وارثین کتاب میں صف اول کے لوگ ہیں۔ یہی دراصل اس وراثت کا حق ادا کرنے والے ہیں۔ یہ اتباع کتاب و سنت میں بھی پیش پیش ہیں' خدا کا پیغام اس کے

بندوں تک پہنچانے میں بھی پیش پیش، دین حق کی خاطر قربانیاں کرنے میں بھی پیش پیش اور بھلائی کے ہر کام میں بھی پیش پیش۔ یہ دانستہ معصیت کرنے والے نہیں ہیں، اور نادانستہ کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر متنبہ ہوتے ہی ان کی پیشانیاں شرم سے عرق آلود ہو جاتی ہیں۔ ان کی تعداد امت میں پہلے دو گروہوں سے کم ہے۔ اس لیے ان کا آخر میں ذکر کیا گیا ہے۔ اگرچہ وراثت کا حق ادا کرنے کے معاملہ میں ان کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔

ذٰلک ھو الفضل الکبیر "یہی بہت بڑا فضل ہے۔" اس فقرے کا تعلق اگر قریب ترین فقرے سے مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نیکیوں میں سبقت کرنا ہی بڑا فضل ہے، اور جو لوگ ایسے ہیں وہ امت مسلمہ میں سب سے افضل ہیں۔ اور اس فقرے کا تعلق پہلے فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ کتاب اللہ کا وارث ہونا اور اس وراثت کے لیے چن لیا جانا بڑا فضل ہے، اور خدا کے تمام بندوں میں وہ بندے سب سے افضل ہیں جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر اس انتخاب میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

آگے فرمایا: "ہمیشہ رہنے والی جنتیں، جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے"۔ مفسرین میں سے ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ اس فقرے کا تعلق قریب ترین دونوں فقروں سے ہے۔ یعنی نیکیوں پر سبقت کرنے والے ہی بڑی فضیلت رکھتے ہیں اور وہی ان جنتوں میں داخل ہوں گے۔ رہے پہلے دو گروہ، تو ان کے بارے میں سکوت فرمایا گیا ہے تاکہ وہ اپنے انجام کے معاملہ میں فکر مند ہوں، اور اپنی موجودہ حالت سے نکل کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ اس رائے کو علامہ زمخشری نے بڑے زور کے ساتھ بیان کیا ہے، اور امام رازی نے اس کی تائید کی ہے۔

لیکن مفسرین کی اکثریت یہ کہتی ہے کہ اس کا تعلق اوپر کی عبارت سے ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ امت کے یہ تینوں گروہ بالآخر جنت میں داخل ہوں گے، خواہ محاسبہ کے بغیر یا محاسبہ کے بعد، خواہ ہر مواخذہ سے محفوظ رہ کر یا کوئی سزا پانے کے بعد۔ اسی تفسیر کی تائید قرآن کا سیاق و سباق بھی کرتا ہے۔ کیونکہ آگے چل کر وارثین کتاب کے بالمقابل دوسرے گروہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ "اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے لیے جہنم کی آگ ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے اس کتاب کو مان لیا ہے، ان کے لیے جنت ہے، اور جنھوں نے اس پر ایمان لانے سے انکار کیا ہے ان کے لیے جہنم۔ پھر اس کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث کرتی ہے جسے حضرت ابوالدرداءؓ نے روایت کیا ہے اور امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، طبرانی، بیہقی اور بعض دوسرے محدثین نے اسے نقل کیا ہے۔ اس میں حضورؐ فرماتے ہیں:

جو لوگ نیکیوں میں سبقت لے گئے ہیں وہ جنت میں کسی حساب کے بغیر داخل ہوں گے اور جو بیچ کی راس رہے ہیں ان سے محاسبہ ہوگا مگر ہلکا محاسبہ۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے تو وہ محشر کے پورے طویل عرصہ میں روک رکھے جائیں گے۔ پھر ان کو اللہ اپنی رحمت میں لے لے گا' اور یہی لوگ ہیں جو کہیں گے کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کر دیا۔

اس حدیث میں حضورؐ نے اس آیت کی پوری تفسیر خود بیان فرما دی ہے' اور اہل ایمان کے تینوں طبقوں کا انجام الگ الگ بتا دیا ہے۔ بیچ کی راس والوں سے "ہلکا محاسبہ" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کفار کو تو ان کے کفر کے علاوہ ان کے ہر ہر جرم اور گناہ کی جداگانہ سزا بھی دی جائے گی' مگر اس کے برعکس اہل ایمان میں جو لوگ اچھے اور برے دونوں طرح کے اعمال لے کر پہنچیں گے' ان کی نیکیوں اور ان کے گناہوں کا مجموعی محاسبہ ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ ہر نیکی کی الگ جزا اور ہر قصور کی الگ سزا دی جائے۔ اور یہ جو فرمایا کہ اہل ایمان میں سے جن لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہوگا وہ محشر کے پورے عرصے میں روک رکھے جائیں گے' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہنم میں نہیں ڈالے جائیں گے' بلکہ ان کو "تا برخاست عدالت" کی سزا دی جائے گی۔ یعنی روز حشر کی پوری طویل مدت (جو نہ معلوم کتنی صدیوں کے برابر طویل ہوگی) ان پر اپنی ساری سختیوں کے ساتھ گزر جائے گی' یہاں تک کہ آخر کار اللہ ان پر رحم فرمائے گا اور خاتمہ عدالت کے وقت حکم دے گا کہ اچھا' انھیں بھی جنت میں داخل کر دو۔ اسی مضمون کے متعدد اقوال محدثین نے بہت سے صحابہ مثلاً حضرات عمرؓ' عثمانؓ' عبداللہ بن مسعودؓ' عبداللہ بن عباسؓ' عائشہؓ' ابو سعید خدریؓ اور براء بن عازب رضی اللہ عنہم سے نقل کیے ہیں' اور ظاہر ہے کہ صحابہ ایسے معاملات میں کوئی بات اس وقت تک نہیں کہہ سکتے تھے جب تک انھوں نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو نہ سنا ہو۔

مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے "اپنے نفس پر ظلم کیا ہے" ان کے لیے صرف "تا برخاست عدالت" ہی کی سزا ہے اور ان میں سے کوئی جہنم میں جانے کا ہی نہیں۔ قرآن اور حدیث میں متعدد ایسے جرائم کا ذکر ہے جن کے مرتکب کو ایمان بھی جہنم میں جانے سے نہیں بچا سکتا۔ مثلاً جو مومن کسی مومن کو عمداً قتل کر دے اس کے لیے جہنم کی سزا کا اللہ تعالیٰ نے خود اعلان فرما دیا ہے۔ اسی طرح قانون وراثت کی خداوندی حدود کو توڑنے والوں کے لیے بھی صاف صاف اعلان فرما دیا گیا ہے کہ وہ اصحاب النار ہیں۔ اس کے علاوہ بعض اور کبائر کے مرتکبین کے لیے بھی احادیث میں تصریح ہے کہ وہ جہنم میں جائیں گے۔

ابن تیمیہ کی ایک وصیت

عبدالحئی ابڑو

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کے ایک شاگرد' ابوالقاسم المغربی نے آپ سے ایک وصیت کی درخواست کی' جس سے وہ دین اور دنیا کی بھلائی حاصل کر سکے۔ انھوں نے ایسی علمی کتابوں کی درخواست بھی کی' جن کے ذریعے اعمال صالحہ میں سب سے بہتر عمل' اور وسائل رزق میں سب سے بہتر رزق کی طرف رہنمائی ہو۔ امام ابن تیمیہ نے جواب میں درج ذیل وصیت کی' جسے الوصیۃ الصغریٰ کا نام دیا جاتا ہے۔

تقویٰ کی وصیت، سب سے بہتر وصیت

میرے علم کے مطابق' پیروی کی خواہش رکھنے والے کسی صاحب فہم کے لیے' اللہ اور اس کے رسول ؐ کی وصیت سے زیادہ مفید کوئی وصیت نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ولقد وصینا الذین اوتوا الکتب من قبلکم وایاکم ان اتقوا اللہ 'تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی' انھیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو۔

(النساء ۴: ۱۳۱)

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ؓ کو یمن کی طرف روانہ کرتے وقت فرمایا: "اے معاذ' اللہ سے ڈرتے رہو' جہاں کہیں بھی ہو۔ اور برائی کے بعد نیکی ضرور کرو' جو اس کو مٹا دے۔ اور لوگوں کے ساتھ نیک اخلاق سے پیش آؤ"۔ حضور ؐ کے نزدیک حضرت معاذ ؓ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ آپ ؐ نے ان سے اپنے پیچھے سواری پر ہمرکابی کی حالت میں' فرمایا: "اے معاذ' بخدا مجھے تم سے محبت ہے۔" انھوں نے اس وصیت کو جامع سمجھا اور بلاشبہ یہ ہے بھی بہت جامع۔ ساتھ ہی یہ قرآنی وصیت کی شرح بھی ہے۔

اس کی جامعیت یوں ہے کہ بندے پر دو قسم کے حقوق ہیں: ایک اللہ تعالیٰ کے' اور دوسرے

بندوں کے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا جو حق ہے' اس میں بعض اوقات اس سے لازماً کوتاہی سرزد ہوگی' یا تو کسی حکم کی بجاآوری میں یا ممنوعہ چیز کا ارتکاب کرکے۔ اس لیے آپ ؐ نے فرمایا: "اللہ سے ڈرو جہاں کہیں بھی ہو"۔ "جہاں کہیں بھی ہو" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ کے لیے ظاہر اور پوشیدہ دونوں حالتوں میں تقویٰ اختیار کرنا ضروری ہے۔

پھر فرمایا: "برائی کے بعد نیکی ضرور کرو جو اسے مٹا دے۔" اس لیے کہ مریض جب کوئی مضر چیز استعمال کر بیٹھے' تو طبیب اسے ایسی چیز کے استعمال کا مشورہ دیتا ہے جو ضرر سے محفوظ رکھے۔ کیونکہ گناہ بندہ کے ساتھ لازم و ملزوم ہے' پس عقل مند وہ ہے جو برائیوں کو مٹانے کے لیے ہمیشہ نیکیاں کرتا رہے۔ نیکیاں بدیوں کی جنس میں سے ہوں' تو انھیں مٹانے میں زیادہ موثر اور کارگر ہوں گی۔

گناہوں کے اثرات تین چیزوں سے زائل ہوتے ہیں: ایک توبہ' دوسرے استغفار اور تیسرے نیک اعمال۔ استغفار' چاہے توبہ کے بغیر بھی ہو' تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کی قبولیت میں اسے بخش دیتا ہے۔ لیکن اگر توبہ و استغفار جمع ہو جائیں تو یہ کمال درجہ ہے۔ تیسرے نیک اعمال' جو گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں۔ یہ نیک اعمال یا تو مقررہ کفارات کی صورت میں ہوتے ہیں' جیسے روزہ توڑنے کا کفارہ یا کفارہ ظہار' یا حج میں بعض ممنوعہ چیزوں کے ارتکاب کا کفارہ' مثلاً (۱) جانور کی قربانی' (۲) غلام آزاد کرنا' (۳) صدقہ و خیرات کرنا' (۴) روزے رکھنا۔

عام نیک اعمال بھی گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں جیسا کہ حضرت عمرؓ سے حضرت حذیفہؓ نے فرمایا: "انسان سے اپنے اہل و عیال اور مال و دولت کے معاملات میں مشغول رہنے کی وجہ سے ذکر الٰہی سے جو غفلت ہو جاتی ہے' نماز' روزہ' صدقہ و خیرات اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام انجام دینے سے وہ معاف ہو جاتی ہے۔" قرآن و سنت کے بے شمار شواہد بتاتے ہیں کہ پنجگانہ نماز' صدقات اور دیگر اعمال صالحہ گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں۔ ان اعمال کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ انسان کی نشوونما کتنے ہی علمی و دینی ماحول میں ہوئی ہو' بلوغت سے مرتے دم تک جاہلیت کے بعض اعمال کا مرتکب ہو ہی جاتا ہے۔

ہر خاص و عام کے لیے جو چیز نفع بخش ہے اور اسے پریشانیوں سے نجات دلا سکتی ہے' وہ ہے گناہوں کا ارتکاب ہو جانے کے فوراً بعد وہ نیکیاں کرنا جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول ؐ کے ذریعہ انجام دینے کا حکم دیا ہے۔

اس کے علاوہ گناہوں کو جو چیزیں مٹاتی ہیں ان میں سے ایک قسم ان مصیبتوں اور پریشانیوں کی بھی ہے' جو انسان کو رنج و غم اور مالی' جسمانی و معنوی لحاظ سے پہنچنے والی تکالیف سے عبارت ہیں' جن

میں انسان کا اپنا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

رسول اللہ ؐ نے اللہ کے حق کو بیان فرمانے کے بعد فرمایا: "لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔" لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنے کا خلاصہ یہ ہے کہ جو قطع تعلق کرے، اس کے ساتھ، سلام کلام، عزت و اکرام، اس کے لیے دعاو استغفار اور اس کی تعریف کے ذریعے جڑا جائے اور میل جول رکھا جائے۔ جو محروم رکھے، اسے تعلیم و تعلم سے اور مالی اور غیر مالی ہر طرح سے فائدہ پہنچایا جائے۔ جو جان، مال یا عزت و آبرو کے لحاظ سے ظلم کرے اور نقصان پہنچائے، اس کو معاف کیا جائے۔ ان میں سے کچھ چیزیں تو واجب ہیں اور کچھ مستحب اور مرغوب۔ "خلق عظیم" کی حقیقت یہ ہے کہ انسان وہ چیزیں انجام دے جو اللہ کو پسند ہیں۔

رہی یہ بات کہ یہ تمام چیزیں اللہ کی وصیت کیونکر ہیں، تو وہ اس لیے کہ اللہ کے خوف اور تقویٰ میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کے حتمی طور پر کرنے کا، یا اس سے رک جانے کا، اللہ نے حکم دیا ہے۔ لیکن چونکہ بسا اوقات تقویٰ سے مراد محض اللہ کے عذاب کا ڈر لیا جاتا ہے، اس لیے حدیث معاذ ؓ میں لفظ تقویٰ کی شرح بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ ؓ نے تقویٰ کی شرح یوں روایت کی ہے: "رسول اللہ ؐ سے پوچھا گیا کہ زیادہ تر کون سی چیز لوگوں کے جنت میں داخلہ کا سبب بنے گی؟ آپ ؐ نے فرمایا، تقویٰ اور بہترین اخلاق۔ پھر پوچھا گیا کہ کون سی چیز زیادہ تر جہنم میں لے جائے گی؟ فرمایا، منہ اور شرم گاہ۔" (ترمذی) حضرت عبد اللہ بن عمر ؓ سے روایت ہے کہ "آپ ؐ نے فرمایا، مسلمانوں میں سب سے کامل مومن وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔"

خیر اور نیکی کا سرچشمہ اور بنیاد یہ ہے کہ آدمی عبادت اور استعانت (فریاد طلبی) صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص کر دے۔ چنانچہ بندے کو مخلوق سے اپنا دل اسی طرح پھیر لینا چاہیے کہ نہ ان سے کسی فائدے کی امید رکھے، اور نہ ان کی خاطر کوئی عمل کرے، بلکہ تمام تر توجہ اور رخ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف ہو۔ اپنی ہر مشکل، پریشانی، تنگدستی اور خطرہ وغیرہ میں اسی کو پکارتا رہے، اور اس کی پسندیدہ چیزیں کرتا رہے۔ جس نے یہ کام کر لیا تو اس کے انجام کا کیا کہنا۔

سب سے اچھا عمل

نیز آپ نے پوچھا ہے کہ فرائض کے بعد سب سے اچھا عمل کون سا ہے؟ تو مختلف لوگوں اور ان کی مصروفیات اور مشاغل کے لحاظ سے، سب کے لیے ایک ہی لگا بندھا جواب ناممکن ہے۔ لیکن جس چیز پر سب کا تقریباً اتفاق ہے، وہ یہ ہے کہ ہمیشہ اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کا التزام وہ بہترین

مشغلہ ہے جس میں بندہ اپنے آپ کو مصروف رکھے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ ؓ کی حدیث اس کی اہمیت واضح کرتی ہے: آپ ؐ نے فرمایا: "مفردون سبقت لے گئے۔" عرض کیا گیا: "مفردون کون لوگ ہیں؟" آپ ؐ نے فرمایا: "اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں۔" حضرت ابو الدرداء ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا: "کیا میں تمھیں وہ عمل بتاؤں جو تمھارے سارے اعمال میں بہتر اور تمھارے مالک کی نگاہ میں پاکیزہ ترہے' اور تمھارے درجات کو تمام اعمال سے زیادہ بلند کرنے والا ہے' اور راہ خدا میں سونا اور چاندی خرچ کرنے سے بھی زیادہ اس میں تمھارے لیے خیر ہے' اور تمھارے لیے اس میں اس جہاد سے بھی زیادہ خیر ہے جس میں تم اپنے دشمنوں اور خدا کے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارو' اور وہ تمھیں ذبح کریں اور شہید کریں؟" صحابہ ؓ نے عرض کیا: "ہاں' یا رسول اللہ ؐ (ایسا قیمتی عمل ضرور بتایئے)"۔ آپ ؐ نے فرمایا: "وہ اللہ کا ذکر ہے۔" (ابوداؤد، احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

ذکر کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ بندہ معلم انسانیت ؐ کے ماثور اذکار کی پابندی کرے۔ جیسے صبح و شام کے اذکار' سوتے وقت' بیدار ہونے پر اور فرض نمازوں کے بعد والے اذکار وغیرہ۔ اسی طرح وہ اذکار اور دعائیں جو مختلف حالات و مواقع کے لیے وارد ہوئی ہیں' جیسے کھانے پینے' گھر' مسجد اور حاجت ضرورت میں داخل ہوتے اور نکلتے وقت کے اذکار۔ اسی طرح بارش ہونے اور بجلی چمکنے اور اس طرح کے دیگر مواقع پر مسنون دعاؤں کا اہتمام۔ اس سلسلے میں "شب و روز کے وظائف" کے عنوان کے تحت کتابیں موجود ہیں۔

پھر عمومی ذکر کا اہتمام بھی کرے' اور اس میں سب سے بہتر لا الٰہ الا اللہ ہے۔ بعض صورتوں میں سبحان اللہ والحمدللہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ولاحول ولاقوۃ الا باللہ اس سے افضل ہے۔

یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ اللہ سے قریب کرنے والی ہر چیز --- جیسے علم سیکھنا سکھانا یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا' چاہے زبان سے ہو' عمل سے ہو' یا قلب میں اس کا خیال پیدا ہو --- وہ بھی اللہ کے ذکر میں شامل ہے۔ چنانچہ جو شخص' ادائیگی فرائض کے بعد' علم نافع کی تلاش میں لگ جائے' یا کہیں بیٹھ کر ایسا علم سیکھے اور سکھائے' تو یہ بھی بہترین ذکر میں شامل ہے۔ اس بنا پر اگر آپ غور کریں' تو سب سے بہتر عمل کے سلسلے میں سلف کی باتوں میں آپ کو کوئی بڑا اختلاف نظر نہیں آئے گا۔

بندے کو اگر کسی معاملے کے متعلق اشتباہ ہو جائے تو اسے استخارہ کر لینا چاہیے۔ اس لیے کہ جو

استخارہ کرے گا وہ کبھی نادم و پشیمان نہیں ہو گا۔ استخارہ اور دعا بکثرت کرنی چاہیے۔ یہ چیز ہر بھلائی کی کنجی ہے۔ اس بارے میں اسے جلدی کرتے ہوئے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں نے بہت دعائیں کیں مگر قبول نہیں ہوئیں۔ دعا کے سلسلے میں قبولیت کے اوقات پیش نظر رہنے چاہییں، جیسے رات کا آخری حصہ، نماز کے بعد، اذان کے دوران اور بارش ہوتے وقت وغیرہ۔

وسائل رزق

جہاں تک کسب حلال کے سب سے زیادہ نفع بخش ذرائع و وسائل کا تعلق ہے، تو وہ ہیں: اللہ پر توکل، اس کے کافی اور رزق رساں ہونے پر پورا بھروسہ، اور اس کے متعلق اچھا گمان۔ چنانچہ رزق کی تلاش کرنے والے کو چاہیے کہ رزق کے معاملے میں اللہ کا سہارا تلاش کرے اور اسی سے مانگے۔ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "تم سب بھوکے ہو مگر جس کو میں کھلاؤں، اس لیے تم مجھ ہی سے رزق مانگو، میں تمھیں کھلاؤں گا۔ میرے بندو، تم سب ننگے ہو مگر جس کو میں پہناؤں، لہٰذا تم مجھ ہی سے لباس مانگو، میں تمھیں پہناؤں گا۔" امام ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "تمھیں اپنی تمام ضرورتیں اور مرادیں اللہ ہی سے مانگنی چاہییں، حتیٰ کہ اگر تمھارے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے، تو وہ بھی اپنے رب ہی سے مانگو، اس لیے کہ اگر وہ نہ دینا چاہے تو کچھ میسر نہیں آسکتا۔"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وسئلوا اللہ من فضلہ "اللہ سے اس کا فضل مانگو"۔ مزید ارشاد ہے: فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ "پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔" (الجمعہ ۶۲:۱۰)۔ یہ آیت اگرچہ نماز جمعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر اس کا اطلاق تمام نمازوں پر ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے آپؐ نے مسجد میں داخل ہوتے وقت اللھم افتح لی ابواب رحمتک اور نکلتے وقت اللھم انی اسئلک من فضلک و رحمتک کی دعائیں پڑھنے کی تعلیم دی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: فابتغوا عند اللہ الرزق واعبدوہ واشکروا لہ۔ اللہ سے رزق مانگو اور اس کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ (العنکبوت ۲۹: ۱۷)۔ یہ امر (حکم) ہے، اور امر، واجب ہونے کا تقاضا کرتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا اور رزق کے معاملہ میں اسی کا دامن تھامنا بہت بڑا دینی اصول ہے۔

پھر چاہیے کہ مال کو پورے استغنائے نفس کے ساتھ لے، تاکہ اس میں برکت واقع ہو۔ حرص و ہوس اور دل کی رغبت و شوق سے اسے نہیں لینا چاہیے۔ بندے کے ہاں مال کی حیثیت ایسی ہو

جائے کہ اس کی ضرورت تو ہے 'مگر دل میں اس کی کوئی جگہ نہیں ' اور مال و دولت کے لیے دوڑ دھوپ صرف اتنی اور اس حد تک ہونی چاہیے ' جیسی قضائے حاجت کے لیے ہوتی ہے۔ ترمذی کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ آپ ؐ نے ارشاد فرمایا: ''جس پر اس حال میں صبح آئی کہ دنیا کا حصول ہی اس کا سب سے بڑا مطمح نظر تھا' تو اللہ اس کے معاملات کو پراگندہ کر دے گا' اور اس کے وسائل رزق کو منتشر کر دے گا' اور دنیا میں سے اسے صرف اتنا ہی حصہ ملے گا' جو اس کی قسمت میں لکھا ہے۔ مگر جس پر صبح اس حال میں آئی کہ آخرت ہی اس کا سب سے بڑا مطمح نظر تھا' تو اللہ اس کے معاملات کو سنوار دے گا' اس کے دل میں استغنا اور بے نیازی پیدا کر دے گا' اور دنیا مجبور و رسوا ہو کر اس کے قدموں میں آگرے گی۔''

ایک بزرگ کا قول ہے کہ تمھیں دنیا میں سے حصہ پانے کی ضرورت تو ہے 'مگر آخرت میں سے حصہ پانے کی تمھیں اس سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ لہٰذا اگر تم نے آخرت کے حصے سے آغاز کیا' تو دنیا کا حصہ تمھیں خود بخود مل کر رہے گا۔

جہاں تک صنعت و حرفت' تجارت و زراعت یا عمارت سازی اور رزق کے اس طرح کے دیگر وسائل و ذرائع میں سے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے کا تعلق ہے 'تو اس کا دارومدار ہر آدمی کے طبعی میلان پر ہے ' اس بارے میں کوئی لگا بندھا اصول و قاعدہ میرے علم میں نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان میں سے کسی پیشہ کو اختیار کرنا چاہے تو اسے حضور ؐ کے سکھائے ہوئے استخارہ پر عمل کرنا چاہیے۔ اس میں ناقابل بیان حد تک برکت ہے۔ اس کے بعد جو چیز اسے میسر ہو جائے ' اسے چھوڑ کر خواہ مخواہ بلا ضرورت کسی اور پیشہ میں ٹانگ نہ اڑائے 'الا یہ کہ اس میں کوئی شرعی قباحت ہو۔

علمی کتب

جہاں تک علم کے حصول کے لیے مناسب کتابوں کا تعلق ہے تو یہ نہایت وسیع میدان ہے۔ اس کا دارومدار کسی حد تک ان ممالک و علاقہ جات پر بھی ہے جہاں انسان پروان چڑھتا ہے ' اس لیے کہ بعض ممالک میں علوم و فنون اور اس کے مسلک و مکتب فکر کی ایسی چیزیں میسر ہوتی ہیں جو دوسرے ممالک میں میسر نہیں ہوتیں۔ لیکن خیر و نیکی کی بنیاد یہ ہے کہ بندہ حضور ؐ سے متوارث علم کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے ' اس لیے کہ یہی وہ علم ہے جو علم کہلائے جانے کا سزاوار ہے۔

انسان کو سب سے بڑھ کر حضور ؐ کے اوامر و نواہی اور آپ ؐ کے کلام کے مقاصد اور حکمتوں کو سمجھنا چاہیے۔ اگر اس کا دل اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ کسی بات کے سلسلہ میں حضور ؐ کا یہی

مطلب اور غرض تھی' تو اسے اللہ کے اور بندوں کے ساتھ تعلق' میں حتی الوسع' اسے چھوڑ کر کسی اور بات پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔ بندے کو کوشش کرنا چاہیے کہ اس کے پاس علم کے تمام ابواب کے متعلق حضور ؐ سے منقول بنیاد موجود ہو۔

اگر لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے کسی معاملہ میں اسے شرح صدر حاصل نہ ہو' تو صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت میں سکھائی گئی دعا کرے۔ رسول اللہ ؐ جب رات کو نماز پڑھنے کے لیے اٹھا کرتے' تو فرماتے: "میرے اللہ' جبریل' میکائیل اور اسرافیل کے رب' زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے' کھلے چھپے کے جاننے والے' تو ہی اپنے بندوں کے اختلافات کے درمیان صحیح فیصلہ کر سکتا ہے۔ جس میں اختلاف ہے' تو حق کی طرف میری رہنمائی فرما' تو جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے خود بھی حدیث قدسی میں فرمایا ہے: "میرے بندو' تم سب گم کردہ راہ ہو مگر جسے میں ہدایت دوں' لہٰذا مجھ ہی سے رہنمائی طلب کرو' میں تمھیں راہ دکھاؤں گا۔"

کتابوں میں صحیح بخاری سے زیادہ مفید کوئی اور کتاب نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ علم کے تمام اصول و مبادی اس میں آگئے ہیں۔ علم کے مختلف ابواب اور فروع میں تبحر کی خواہش رکھنے والا شخص اپنا پورا مقصد صرف اسی کتاب پر انحصار کر کے حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ دیگر احادیث اور ان معاملات کے بارے میں اہل علم و فقہ کے اقوال و آرا کا جاننا بھی ضروری ہے' جن کا علم ان حضرات ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ مگر جس شخص کو نور بصیرت سے محروم رکھا گیا ہے' کتب کی بہتات' اس کی سرگردانی اور گمراہی میں اضافہ ہی کرے گی' جیسا کہ آنحضور ؐ نے حضرت ابو عبیدہ انصاریؓ سے فرمایا تھا: "کیا یہود و نصاریٰ کے پاس تورات و انجیل موجود نہیں ہے؟ ان (تورات و انجیل) نے انھیں کیا فائدہ پہنچایا؟"

نیا ایمان

ابوالحسن علی ندوی

ایک چیز ہے دین ' اور ایک ہے ایمان۔ ان دونوں میں ایک فرق ہے۔ دین تو وہ نظام ہے جس کو لے کر تمام انبیا آتے رہے ' اور جس کا آخری پیغام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے ' اور اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ کے ذریعہ اس دین کو مکمل فرمایا۔ دین تو یقیناً مکمل ہو چکا۔ لیکن دوسری چیز ہے اس دین پر یقین کرنا ' اور اسی دین کی حقیقتوں پر ایمان لانا۔ اس میں کسی اضافہ کی دعوت نہیں دی جا سکتی۔ اس میں جس طرح کچھ گھٹایا نہیں جا سکتا ' بڑھایا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن ایمان کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ ترقی کی گنجایش ہے۔ اس لیے ایمان میں تازگی اور زیادتی کی دعوت قیامت تک جاری رہے گی۔ ضروری ہے کہ دین پر اپنے ایمان ویقین کو مضبوط کرنے ' اس کو اپنی زندگی بنانے ' اور ہر چیز کو اس پر قربان کرنے اور اس کو کسی چیز کے عوض ہاتھ سے نہ دینے کی کوشش برابر جاری رہے۔ اس امت کی ہر نسل ' ہر حصے اور ہر دور کے لیے اس دین پر نیا ایمان لانا ضروری ہے۔

آنحضرت ؐ کی بعثت کے وقت دین کا وجود بالکل ختم نہیں ہو چکا تھا۔ قدیم مذاہب و ادیان کی بہت سی شکلیں اور صورتیں موجود تھیں ' لیکن دین میں کوئی طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ لوگوں کا ان حقیقتوں پر تو ایمان ویقین تھا کہ سانپ کا زہر قاتل ہے ' ہوا زندگی کے لیے ضروری ہے ' کھانے سے پیٹ بھرتا ہے ' لیکن اس پر ایمان نہیں تھا کہ دوزخ کی آگ کیسی خطرناک ہے اور جنت کا آرام اور اس کی راحتیں کیسی قابل رشک ہیں۔ ان کا ایمان نہیں تھا کہ اللہ کو ناراض کر کے وہ فلاح پا سکتے ہیں درآنحالیکہ ان کا نوکر ان کی نافرمانی کر کے ان کے گھر میں نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کا ایمان تھا کہ آگ کی ایک چنگاری گھروں کو خاک سیاہ کر سکتی ہے۔ لیکن ان کا ایمان نہیں تھا کہ گناہ و ظلم سے بستیاں اور

ملک تباہ ہو سکتے ہیں۔ ایک طبیب کی باتوں پر وہ جتنا اعتماد کرتے تھے' رسولؐ کی باتوں پر اتنا بھی اعتماد نہیں تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کا تعلق دین اور دوسری زندگی سے مردہ ہو چکا تھا' اور انھیں اس سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ صرف دنیا کی زندگی اور اس کی دیکھی بھالی اور آزمائی ہوئی حقیقتیں ان پر چھائی ہوئی تھیں۔

کچھ ایسا ہی حال اب ہمارا ہو گیا ہے۔ اگر اس وقت کوئی یہاں آکر کہہ دے کہ عجائب گھر سے شیر چھوٹ گیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ پورا مجمع اسی طرف متوجہ ہو جائے گا' اور سب کو اپنی اپنی فکر پیدا ہو جائے گی۔ اجتماع کا سارا سکون' انتشار سے بدل جائے گا کیونکہ ہماری زندگی ہمارے اوپر حاوی ہے۔ جب کوئی خطرہ زندگی کو چیلنج کرتا ہے تو ہماری قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں' اور زندگی کے لیے محافظ بن جاتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اس زندگی کے خطرات سے آپ کو آگاہ کرے' جو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہے' اور جس میں تکلیف ہے تو دوامی اور آرام ہے تو دوامی اور غیر فانی' تو ہم نہایت بے توجہی اور بے فکری سے سن لیں گے۔ اس کا سبب بے دینی نہیں ہے' بلکہ دین پر ایمان کی کمی اور کمزوری' اور ایک طرح کی بے یقینی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایمان کی اس درجہ کمزوری کے ساتھ ایک ایسی زندگی سے کیسے دلچسپی ہو سکتی ہے' اور کیسے اس کے خطرات کی فکر پیدا ہو سکتی ہے جو بالکل آڑ اور اوٹ میں ہے۔

آنحضرتؐ کو جب اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بنایا' اس زمانہ میں عرب میں ایک دستور یہ تھا کہ اگر کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلہ پر حملہ آور ہوتا' اور اس قبیلہ کا کوئی شخص حملہ آور لشکر کو اس وقت دیکھ لیتا جب وہ بالکل سر پر پہنچ چکا ہوتا' تو وہ شخص دوڑ کر پہاڑ پر چڑھ جاتا اور بالکل برہنہ ہو جاتا' اور دہائی دیتا۔ اس شخص کو النذیر العریان کہا جاتا تھا۔ اس کا یہ فعل اس بات کی علامت ہوتی کہ دشمن بالکل سر پر آپہنچا ہے' اور جس حال میں بھی ہو اسی حال میں مقابلے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔

اسی دستور کے مطابق آنحضرتؐ ایک دن ایک پہاڑ پر چڑھ گئے' مگر آپؐ کپڑے پہنے رہے اور پکارا انا النذیر العریان۔ مکہ والے آپؐ کی صداقت اور شرم و حیا کے معترف تھے' اس لیے سارا شہر آنا فانا کام کاج چھوڑ کر پہاڑ کے دامن میں جا جمع ہوا۔ انھوں نے اتنی توجہ اور فکر سے اس لیے کام لیا تھا کہ حضورؐ کے اس فعل کو انھوں نے اپنی زندگی کے لیے ایک خطرے کی علامت سمجھا تھا۔ وہ سمجھے تھے کہ کوئی دشمن حملہ آور ہو رہا ہے' جس کی اطلاع یہ ہمیں دیں گے۔ جب حضورؐ نے فرمایا' کہ اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے دشمن کا لشکر چھپا ہوا ہے جو تمھاری گھات میں ہے' تو کیا تم مجھے سچا سمجھو گے؟ حالانکہ تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو' مگر میں چونکہ اوپر کھڑا ہوں اس لیے میری نظر اور اس کے درمیان کوئی آڑ نہیں ہے۔ سب نے کہا' بیشک' ہم آپؐ کی تصدیق کریں گے۔ مگر جب آپؐ نے

فرمایا کہ وہ لشکر 'عذاب الٰہی کا لشکر ہے ' جو بالکل سر پر کھڑا ہوا ہے ' میری بات مانو تو اس کے حملہ سے بچ سکتے ہو۔ یہ سن کر ان کی ساری توجہ اور ساری فکر ختم ہو گئی۔ وہ پچھتائے 'اور کہنے لگے کہ کیا آپ نے یہی بات سنانے کو ہمیں یہاں بلایا تھا؟... یہ کیا بات تھی؟ ان پر بس اپنی دنیا کی زندگی چھائی ہوئی تھی اس کے ہر خطرے پر ان کے کان کھڑے ہو جاتے تھے 'مگر دوسری زندگی کا انھیں خیال نہ تھا' اس لیے اس کے خطرات کی انھیں مطلق فکر نہ ہوتی تھی۔

آنحضرت ؐ کے زمانہ میں مختلف مذاہب موجود تھے اور وہ ایمان کے مدعی تھے 'مگر ان کے ماننے والوں کا ایمان اتنا بے جان اور بوسیدہ ہو گیا تھا کہ محض فرضی اور خیالی تکالیف کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا' اور ان کی مرغوب معصیتیں اور بداخلاقیاں نہیں چھڑا سکتا تھا۔ ان کے پاس دین تو موجود تھا مگر ایمان کی طاقت اور تازگی کھو جانے کی وجہ سے 'وہ دین چھوٹے چھوٹے حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی انھیں آمادہ نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن رسول اللہ ؐ کے لائے ہوئے دین پر سچے دل سے ایمان لانے والوں کا حال ان لوگوں سے بالکل مختلف تھا۔ انھیں اس زندگی سے زیادہ دوسری زندگی سے دلچسپی تھی 'اس کی فکر تھی۔ ان کا دین ان سے بڑی سے بڑی قربانی بہ آسانی کرا لیتا تھا' اس لیے کہ دین اور دینی حقیقتوں پر ان کا ایمان تازہ اور نہایت جاندار تھا۔ دوسرے مذاہب کے ٹھیکیداروں اور ان سچے دین داروں میں ایسا فرق تھا' جیسا کاغذ کی تصویر اور ایک زندہ انسان میں 'یا آگ کی تصویر اور خود آگ میں۔ نئے ایمان نے صحابہ کرام ؓ کی رگ رگ میں وہ آگ بھر دی تھی کہ مقابلے میں آنے والے 'جو اس ایمان سے محروم تھے 'موی تصویروں کی طرح پگھل جاتے تھے 'یا اپنی خیر مناتے ہوئے سامنے سے ہٹ جاتے تھے۔ ان کی تلواروں میں لوہے کی گرمی نہ تھی 'بلکہ ان کے ایمانوں کی گرمی تھی۔ وہ فاقہ کش اور خرقہ پوش مجاہد ہتھیار کی طاقت پر نہیں بلکہ ایمان کی طاقت پر لڑتے تھے اور دشمنوں کے چھکے چھڑا دیتے تھے۔ ان کا یقین تو یہ تھا کہ اگر ساری دنیا کی تلواریں ہماری گردنوں پر پڑیں 'مگر اللہ کا حکم نہ ہو تو ہمیں کوئی نہیں مار سکتا۔ جبکہ ان کے مقابل یہ یقین رکھتے تھے کہ تلوار کا ایک ہی وار ہمارا خاتمہ کر دے گا۔ اس نئے ایمان کی طاقت نے ان غریب عربوں کے دل میں سے ان کی کمزوری کا احساس بالکل نکال دیا تھا۔ ایران کے دربار میں جب ان کے سفیر گئے تو ان کی تلواروں پر چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے 'اور گھوڑے پست قامت تھے۔ مگر ان کا ایمان شعلہ زن تھا اور ان ہی کی طاقت ساری طاقتوں پر غالب تھی۔ یہی طاقت تھی 'جس سے سپہ سالار ایران رستم بھی لرزاں تھا' اور ایران کے سارے درباری بھی اپنی اپنی فکر میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی اسی قوت نے انھیں اس قدر جری اور نڈر بنا دیا تھا کہ ان کے درباروں میں قالینوں

پر گھوڑوں کو لیے ہوئے چلے جاتے اور تخت پر نیزہ گاڑ دیتے تھے۔

اسی ایمان کا فرق تھا کہ حضور ؐ کی بعثت کے وقت اگر نمازیں تھیں بھی تو خشوع و خضوع نہ تھا' اور اگر حج تھا' تو اس کی روح نہ تھی۔ لیکن جو لوگ حضور ؐ کی دعوت پر ایمان لے آئے' ان میں آپ ؐ نے ایسا ایمان پیدا فرمایا کہ' حج و نماز کے وقت کے علاوہ بھی' وہ ان پر چھایا رہتا تھا۔ اور وہ گویا ہر دم خدا اور آخرت کو اپنی آنکھوں کے سامنے پاتے تھے۔ اسی دنیا میں جنت کی خوشبوئیں تک محسوس کر لیتے تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میدان جنگ میں اپنے ایک صحابی کے متعلق' ایک دوسرے صحابی سے حضور ؐ نے فرمایا' کہ جاؤ ذرا فلاں کا پتا چلاؤ' کس حال میں ہیں۔ (یعنی صحیح سلامت ہیں یا خدانخواستہ زخمی پڑے ہیں' یا جاں بحق ہو گئے)۔ انھوں نے ایک جگہ دیکھا' زخمی پڑے ہوئے ہیں اور تقریباً وقت آخر ہو رہا ہے۔ کہا: "حضور ؐ نے حال دریافت فرمایا ہے۔" جواب دیا: "جاؤ' میرا اسلام عرض کرنا' اور عرض کر دینا کہ حضور ؐ' جنت کی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔" حضرت ابو ہریرہ ؓ کا واقعہ ہے کہ وہ مرض الوفات کی سخت تکلیف میں مبتلا تھے' بیوی قریب بیٹھی تھیں۔ تکلیف کی شدت دیکھ کر ان کے منہ سے نکلا' واکرباہ! حضرت ابو ہریرہ ؓ کی جب ذرا طبیعت سنبھلی' فوراً بولے: "کیا کہتی ہو؟ واکرباہ' نہیں' واطرباہ! واطرباہ! غدا القی الاحبت محمد او حزبہ (واہ کیا خوشی کا موقع ہے' کیا نشاط کا عالم ہے! کل ہم دوستوں سے ملیں گے' محمد ؐ اور آپ ؐ کی جماعت سے ملیں گے)"۔

غرض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دین کی حقیقتوں پر ایسا یقین تھا کہ ہمیں محسوسات و مشاہدات پر بھی ویسا یقین نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی' کہ ان کا ایمان نیا اور تازہ تھا' اور ہر نئی اور تازہ چیز میں ایک قوت اور شادابی ہوتی ہے۔

حضرت ابوذر غفاری ؓ جب حضور ؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے' تو اس کا جوش پیدا ہوا کہ حق کا اعلان اور اظہار کروں۔ آپ نے بیچ حرم میں جا کر بلند آواز سے کلمہ پڑھا۔ کفار چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے' اور خوب زدوکوب کیا۔ مگر ان کو وہ لذت ملی کہ دوسرے دن پھر جا کر یہی کام کیا اور پھر پٹے گئے۔ یہ دراصل ان کے ایمان کی تازگی تھی۔ ان کا نیا اور تازہ ایمان' دین کی راہ میں دنیا کی ہر تکلیف کو حلاوت و لذت سے بدل دیتا تھا۔

حضرت عبداللہ ذوالبجادین ؓ اسلام لانے سے قبل اپنے والد کے فوت ہو جانے کی وجہ سے اپنے چچا کے پاس رہا کرتے تھے' اور انھی کا کام کاج کیا کرتے تھے' ان کی بکریاں وغیرہ چرانے لے جاتے تھے۔ کانوں میں اسلام کی آواز پہنچ چکی تھی۔ ایک دن تہیہ کر لیا کہ آج محمد صلی اللہ علیہ و آلہ

وسلم کی خدمت میں جاکر اسلام لے آتا ہے۔ چچا کے پاس آئے 'بکریوں کا ریوڑ ان کے حوالہ کیا' اور کہا' میں اب اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں' اسلام قبول کرنے جا رہا ہوں۔ چچا نے کہا: "بدن پر جو کپڑے ہیں اتارتے جاؤ۔" ظالم نے بالکل برہنہ کر کے چلتا کر دیا۔ کسی نہ کسی طرح والدہ کے پاس پہنچے' اور پہننے کے لیے کپڑا مانگا۔ انھوں نے ایک کمبل دیا' جس کے دو ٹکڑے کر کے ایک اوڑھا' ایک باندھا' اور حضورؐ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ پھر بقیہ زندگی آپ کے قدموں میں گزار دی۔ ذوالبجادین ؓ کا لقب آپ ؐ نے ان کے دو کمبلوں کی وجہ سے دیا تھا۔

نیا اور تازہ ایمان' اس زندگی کو بالکل بے وقعت بنا دیتا ہے' اور اس کو قبول کرنے والا فوراً داعی و مجاہد بن جاتا ہے۔ ایک جنگ کے موقع پر رومیوں کی صف سے ایک بہادر نکلا اور اس نے حضرت خالد ؓ کو پکارا۔ آپ گئے۔ اس نے بجائے لڑنے کے اسلام کے متعلق کچھ سوالات شروع کر دیے' اور آخر میں دریافت کیا کہ تمھارے دین میں داخل ہونے کا طریقہ کیا ہے۔ آپ نے سب سوالات کے جوابات دیے' اور اپنے خیمہ میں آئے' وہاں اسے غسل کرایا اور کلمہ پڑھایا۔ اس نے دو رکعت نماز پڑھی اور پھر میدان جنگ میں واپس آیا اور اللہ کی راہ میں بڑی بہادری اور بے جگری سے لڑ کر شہید ہو گیا۔ یہ تھی' نئے اور تازہ ایمان کی کشش' کہ حضرت خالد ؓ بیچ میدان جنگ میں سے ایک دشمن کو اسلام کا خادم بنا کے لے آئے' اور اس نے اسلام قبول کرتے ہی اپنی زندگی اس پر نثار کر دی۔

آج کی ضرورت' دراصل ایمان کی اسی اصل طاقت کو حاصل کرنے کی دعوت ہے۔ ایسا ایمان پیدا کرنے کی دعوت' جس سے ہمارے متعلقین اور ہمارے احباب بھی ایک خوشبو محسوس کریں۔ پھول میں اگر خوشبو ہوتی ہے تو ضرور محسوس ہوتی ہے۔ آگ میں جب گرمی ہوتی ہے تو ضرور محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ہمارے ایمان میں خوشبو ہو' گرمی ہو' تو اس سے دوسرے ضرور متاثر ہوں گے' ورنہ دوسروں کی شکایت اور غیروں کے شکوے بیکار ہیں۔

حمص میں مسلمانوں کا غلبہ ہوا' اور وہاں جزیہ وصول کیا گیا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد خلیفہ وقت کے حکم سے اس جگہ کو چھوڑ کر جانا پڑا' تو جزیہ کی ایک ایک پائی کا حساب کر کے واپس کیا گیا۔ یہ ان کے ایمان کا اثر تھا۔ حمص کے یہودیوں اور عیسائیوں نے اس سے ان کے ایمان کی خوشبو محسوس کی۔ چنانچہ جب مسلمان رخصت ہو رہے تھے' تو وہ لوگ روتے تھے' اور دعائیں کرتے تھے' کہ اللہ تم کو پھر واپس لائے۔ اسی طرح اگر ہمارے اندر کوئی ایمانی طاقت' کوئی اندرونی قوت' اور اخلاقی برتری ہو' تو ناممکن ہے کہ دوسرے انسان اس کو محسوس نہ کریں۔

مسلمانوں کے پاس سرمایہ' علم' تمدن اور دوسری دولتوں کی کمی نہیں ہے۔ اصل میں جو کمی ہے

اور جس سے لوگوں کی نگاہیں بدل گئیں اور مسلمان دنیا کی نظروں سے گر گئے وہ ایمان کی تروتازگی اور شادابی کی کمی ہے۔ اس کمی کا اثر آج ہی نہیں ' اسی وقت ظاہر ہو گیا تھا ' جب مسلمان صاحب اقتدار و حکومت بھی تھے۔ بنی امیہ کے عہد میں حکومت کی طرف سے 'ایک غیر مسلم باج گزار ریاست میں جزیہ کی رقم وصول کرنے کے لیے 'محصل گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب اسلامی حکومت کے محصل حکومتی کروفر کے ساتھ وہاں گئے تھے۔ والی ریاست نے کہا: ''وہ اللہ کے بندے کہاں ہیں جو پہلے آیا کرتے تھے ' جو گھاس کے چپل پہنے ہوئے تھے ' جن کے چہروں سے فاقہ کشی اور کپڑوں سے غربت ٹپکتی تھی۔'' اس کو بتلایا گیا کہ وہ تو اگلے زمانہ کے مسلمان تھے ' اب وہ کہاں۔ اس نے کہا: ''اب ہم ایک پیسہ خراج کا نہیں دیں گے۔ ہم نے اب تک ان سے مرعوب ہو کر خراج دیا تھا۔ وہ جس وقت کہتے تھے کہ اللہ کے بندے ' اللہ کا مطالبہ دے تو ہم ان کی بات کو رد نہیں کرتے تھے ' لیکن تم سے مرعوب ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تمھارا جو جی چاہے ' کر لو''۔۔۔

دنیا کو آج اس تروتازہ ایمان کی شدید ضرورت ہے ' مگر یہی ضروری چیز دنیا سے ناپید ہو گئی ہے۔ آج یورپ کے کارخانوں نے دنیا کی ہر ضروری 'بلکہ غیر ضروری چیز بھی بنا ڈالی ہے ' جسے ہر ضرورت مند بازار سے خرید سکتا ہے۔ مگر وہ چیز جس کو پیدا کرنے سے یورپ کے کارخانے بھی عاجز ہیں ' یہی خالد ؓ و ابوذر ؓ کا ایمان ہے۔

غیر مسلموں سے تعلقات اور اسلامی تعلیمات

غیر مسلم رشتہ دار اور پڑوسی

سید جلال الدین عمری

آج دنیا بھر میں مسلمان، غیر مسلموں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پاکستان میں ان کی ایک بڑی تعداد ہے۔ ہندوستان، مغرب اور چین جیسے مقامات پر مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیاں موجود ہیں۔ ان ممالک میں غیر مسلم بھی اسلام قبول کر رہے ہیں۔ ایک تاثر موجود ہے، پیدا کیا گیا ہے، اور خود مسلمان بھی اسے تقویت دے رہے ہیں، کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ اجتناب، سوشل بائیکاٹ، شدت و غلظت اور شاید نفرت اور بدسلوکی کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر اسلامی تعلیمات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ہم اس موضوع پر، ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ (بھارت) کے سیکرٹری، مولانا سید جلال الدین عمری کا ایک بصیرت افروز مقالہ، (معمولی حذف و ترمیم کر کے) ان کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ بے شمار مسلمانوں کے لیے یہ تحریر چشم کشا ثابت ہوگی۔ (مدیر)

اسلام کی تصویر جن مختلف پہلوؤں سے بگاڑنے بلکہ مسخ کرنے کی مسلسل کوشش ہوتی رہتی ہے ان میں ایک غیر مسلموں سے تعلقات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام مسلمانوں میں علیحدگی کے جذبات ابھارتا ہے، وہ انھیں دوسروں سے کاٹتا اور الگ تھلگ کرتا ہے، وہ اپنوں اور غیروں کے درمیان اتنا زبردست فرق پیدا کرتا ہے کہ غیروں کے ساتھ عام انسانی تعلقات کا بھی روادار نہیں ہوتا۔ وہ اخلاق کا درس ضرور دیتا ہے لیکن ان کا تعلق اپنے ماننے والوں سے ہے، دوسروں سے نہیں ہے۔ جو لوگ اسلام کے دائرے میں آجائیں، انھیں وہ باہم اخلاقی رویہ اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے، لیکن اس دائرہ سے باہر اس کی تعلیمات کا رخ بدل جاتا ہے، اور وہ ایک دوسری ہی شکل میں ہماری سامنے آتا

ہے۔ یہ شکل بڑی بھیانک ہے۔ اس میں محبت کی جگہ نفرت و عداوت اور نرمی کی جگہ سختی اور درشتی نمایاں ہوتی ہے۔ اسلام کے ماننے والوں کی اپنے مخالفین سے مخاصمت شروع ہو جاتی ہے اور وہ ان سے برسرپیکار نظر آتے ہیں۔

اسلام کی اس خود ساختہ تصویر کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ جن ذہنوں کی پیداوار ہے وہ یا تو ناواقفیت کا شکار ہیں یا دوسروں کو فریب اور دھوکا دینا چاہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام 'مسلمانوں کو باہم اعلیٰ اخلاقی رویہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے' انھیں ایک دوسرے کا بھائی قرار دیتا ہے' ان کے اخلاقی اور قانونی حقوق مقرر کرتا ہے' ان کے درمیان تعاون و تناصر کا جذبہ بیدار کرتا ہے' اور انھیں ایک نظام حیات دے کر ایک امت بناتا ہے۔ اس امت کو اس نے ایک اعلیٰ نصب العین دیا ہے' وہ یہ کہ دنیا میں خدائے واحد کے دین کی علم بردار بن کر اٹھے' انسانوں کو ان کی دنیا اور آخرت کی فلاح کا پیغام دے' دنیا میں خیر کو عام کرے' بھلائیوں کو پھیلائے اور برائیوں کو مٹائے۔

اس دین کے بارے میں یہ تصور کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ وہ انسانوں کے دلوں میں کدورت اور نفرت پیدا کرتا ہے' انھیں ایک دوسرے کا حریف اور دشمن بناتا ہے اور ان کے تعلقات میں بگاڑ اور فساد کا ذریعہ بنتا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

قرآن مجید میں والدین' قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں' پڑوسیوں' مسافروں اور غلاموں وغیرہ کے ساتھ حسن سلوک کا عام حکم دیا گیا ہے' اور ان کے ساتھ غیر اخلاقی سلوک کی مذمت کی گئی ہے۔ لہٰذا حسن سلوک ہر ایک کے ساتھ مطلوب ہے' اس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ جس کسی کے ساتھ بھی غیر اخلاقی رویہ اختیار کیا جائے وہ غیر اسلامی رویہ ہو گا۔

غیر مسلم والدین سے تعلقات

والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم قرآن مجید نے ایک جگہ ان الفاظ میں دیا ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ (۱۴) وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا۔

ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری

اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ اس لیے ہم نے اسے وصیت کی کہ تم میرا بھی شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی۔ میری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے۔ اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شرک کرے جس کا تجھے علم نہیں ہے تو ان کی بات نہ مان، اور ان کے ساتھ معروف کے مطابق اپنا برتاؤ رکھ۔ (لقمان ۳۱: ۱۴-۱۵)

ان آیات میں صاف طور پر ہدایت کی گئی ہے کہ والدین کے ساتھ، چاہے وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں، حسن سلوک کیا جائے گا۔ ان کے شرک و کفر کی وجہ سے، ان کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی روا نہ ہوگی۔ علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جَاهَدٰكَ، کے الفاظ سے واضح کر دیا ہے کہ حسن سلوک کا یہ حکم مسلم والدین اور غیر مسلم والدین دونوں ہی کے لیے ہے۔ پھر یہ فرما کر صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا، اس حکم کو موکد اور مستحکم کر دیا ہے۔

اس کے قانونی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ باپ اگر اولاد کو قتل کر دے تو اس سے (شریعت کے عام ضابطہ کے مطابق) قصاص نہیں لیا جائے گا، وہ اس پر تہمت لگائے تو اس پر حد نہیں جاری ہوگی، اولاد کے قرض کی عدم ادائیگی پر اسے قید نہیں کیا جائے گا، اور یہ کہ والدین محتاج ہوں تو ان کا نان و نفقہ اولاد پر واجب ہوگا، اس لیے کہ یہ ساری چیزیں معروف کے ساتھ برتاؤ میں آتی ہیں اور اس کے خلاف اقدام اس کے منافی ہوگا۔ (احکام القرآن، ج ۳، ص ۳۳۲)

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے کہ آدمی کے والدین کا، چاہے مسلمان ہوں یا کافر، نان و نفقہ اس پر واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافر والدین کے ساتھ بھی برتاؤ میں معروف کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ اس کا تقاضا ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ لیس من المعروف ان یعیش فی نعم اللہ تعالٰی ویترکھما جوعا، یعنی یہ کوئی نیکی اور معروف نہیں ہے کہ آدمی خود تو اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا رہے اور والدین کو بھوکا مرنے کے لیے چھوڑ دے۔ (ایضاً ج ۲، ص ۴۲۶-۴۲۵)

اسلام مشرک والدین کے ساتھ حسن سلوک کا روادار ہے یا نہیں اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ حضرت اسما بنت ابوبکرؓ کہتی ہیں کہ (صلح حدیبیہ کے دوران) میری ماں جو مشرک تھیں، مجھ سے ملنے آئیں۔ (ان کا نام قتیلۃ تھا جنھیں حضرت ابوبکرؓ نے جاہلیت کے زمانہ میں طلاق دے دی تھی، فتح الباری، ۵/ ۳۰۲) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ انھیں مجھ سے کچھ توقع ہے، کیا میں ان کے ساتھ تعاون اور ہمدردی کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: "اپنی ماں کے

ساتھ صلہ رحمی کرو۔" (بخاری، کتاب الہبہ۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ) ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بطور تحفہ پنیر اور مکھن لائی تھیں۔ حضرت اسماءؓ نے انھیں اپنے گھر میں آنے کی اجازت دینے اور ان کا تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور رسولؐ سے دریافت کرایا۔ آپؐ نے ان سے کہا کہ وہ ان کا تحفہ قبول کرلیں، اور اپنے گھر بھی آنے دیں۔ (نیل الاوطار، ۶/۶-۱۰۷، بحوالہ مسند احمد)

امام نووی فرماتے ہیں: اس حدیث سے مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کا ثبوت ملتا ہے۔ (نووی، شرح مسلم، ج ۳، ص ۸۹)

کافر والدین کا انتقال ہو جائے، تو مسلمان اولاد ضرورت پر ان کے کفن دفن کا نظم کرے گی۔

رسول اکرمؐ کے چچا ابو طالب بیمار ہوئے، تو آپؐ نے ان کی عیادت فرمائی۔ جب انتقال ہوا، تو حضرت علیؓ نے آپ کو اس کی اطلاع دی۔ (ابو طالب کی وفات کی خبر سن کر آپؐ رو پڑے، ابن سعد) اور دریافت کیا کہ انھیں کون دفن کرے گا؟ آپؐ نے فرمایا جاؤ، اپنے باپ کو دفن کرو۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا، وہ تو مشرک تھے اور ہدایت سے محروم تھے۔ آپؐ نے فرمایا، جاؤ اور اپنے باپ کو دفن کرو، پھر اور کوئی کام کیے بغیر سیدھے میرے پاس آؤ۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں: "میں گیا، انھیں دفن کیا (بعض روایات میں غسل اور کفن کا ذکر بھی ہے، ملاحظہ ہو زیلعی، نصب الرایہ، ج ۲، ص ۲۸۱-۲۸۲) اور آپؐ کی خدمت میں پہنچا۔ آپؐ نے مجھے غسل کا حکم دیا اور دعا دی، ایسی دعا کہ اس کے عوض مجھے سرخ و سیاہ اونٹ (دنیا جہاں کی دولت) بھی پسند نہیں۔" (ابو داؤد، کتاب الجنائز۔ نسائی، کتاب الطہارۃ) مشہور تابعی مکحول کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کے جنازہ میں شرکت کی تھی۔ کنارے کنارے چلے، ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ فرمایا، رشتہ نے آپ کو مجھ سے جوڑ دیا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ ان کی قبر پر آپ کھڑے نہیں ہوئے۔ (عبدالرزاق، المصنف، ج ۶، ص ۳۸)

ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ ہمارے علما (احناف) نے کہا ہے کہ کسی مسلمان کے کافر ماں باپ کا انتقال ہو جائے تو وہ انھیں غسل دے گا، جنازہ کا ساتھ دے گا اور دفن کرے گا۔ اس لیے کہ ان کے ساتھ معروف کے مطابق حسن سلوک کا جو حکم دیا گیا ہے، یہ اس میں شامل ہے۔ (احکام القرآن، ج ۲، ص ۳۶۲)

کافر ماں باپ کے انتقال کے بعد اگر ان کی یاد آجائے تو آدمی ان کی قبر پر بھی جا سکتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت فرمائی، تو آپ

کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، اور جو صحابہ کرام ساتھ تھے وہ بھی رو پڑے۔ آپ ؐ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے اپنی ماں کے لیے استغفار کی اجازت مانگی، لیکن مجھے اس کی اجازت نہیں ملی۔ میں نے ان کی قبر کی زیارت کی اجازت مانگی، تو دے دی گئی۔ تم لوگ قبروں کی زیارت کرو، اس سے موت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ (مسلم، کتاب الجنائز۔ ابو داود، کتاب الجنائز)

اس حدیث کے ذیل میں امام نووی ؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے مشرکین کی، ان کی زندگی میں زیارت اور ملاقات اور مرنے کے بعد ان کی قبور کی زیارت کا جواز نکلتا ہے۔ اس لیے کہ جب ان کی زیارت ان کی وفات کے بعد جائز ہے تو زندگی میں بدرجہ اولیٰ جائز ہونی چاہیے۔ (شرح مسلم، ج ۲، جز ۷، ص ۴۵)

غیر مسلم رشتہ داروں سے تعلقات

قرآن مجید نے دیگر رشتہ داروں کے حقوق بھی بیان کیے ہیں، اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی بار بار تاکید کی ہے۔ احادیث میں بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے۔ ان میں مسلم اور غیر مسلم رشتہ دار دونوں ہی آتے ہیں۔ بعض قانونی احکام میں ان کے درمیان فرق ہے۔ لیکن حسن سلوک اور تعاون اور ہمدردی کے غیر مسلم رشتہ دار بھی مستحق قرار دیے گئے ہیں۔ یہاں پہلے ایک قانونی فرق کی وضاحت کی جا رہی ہے۔

قرآن مجید نے وراثت کے سلسلے میں یہ قانون بیان کیا ہے کہ آدمی کے خونی رشتہ دار ہی اس کے وارث ہو سکتے ہیں، غیر رشتہ دار وارث نہیں ہو سکتے۔ اسلامی قانون وراثت میں دین کا بھی اعتبار کیا گیا ہے۔ اس کی رو سے مسلم اور غیر مسلم ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ ایک مسلمان کی وراثت کا حق اس کے مسلمان قرابت داروں ہی کو ہے، غیر مسلم قرابت دار اس کے وارث نہیں ہوں گے۔ اسی طرح غیر مسلم کی وراثت کا حق اس کے غیر مسلم رشتہ داروں ہی کو حاصل ہو گا، مسلمان رشتہ دار اس سے محروم رہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح حدیث ہے: "نہ مسلمان کافر کا، اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہو گا۔" (بخاری، کتاب الفرائض)

وراثت سے ہٹ کر جو رشتہ دار وارث نہیں ہیں، آدمی ان کی مدد اور تعاون کر سکتا ہے اور اسے کرنا چاہیے۔ وقت ضرورت ان کے حق میں وصیت بھی کی جا سکتی ہے:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا۔

اور اللہ کی کتاب میں رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں۔ اہل ایمان اور مہاجرین میں سے۔ مگر یہ کہ تم اپنے رفیقوں کے ساتھ کوئی بھلائی کرنی چاہو تو کر سکتے ہو۔ (الاحزاب ۳۳: ۶)

سوال یہ ہے کہ کیا، غیر وارث، مسلم قرابت داروں کی طرح، غیر مسلم رشتہ داروں کی بھی مدد کی جا سکتی ہے، اور ان کے لیے وصیت کرنا صحیح ہے؟ فقہاء سلف نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ اسے وہ جائز سمجھتے ہیں۔ اس کی بنیاد سورۂ احزاب کی یہی آیت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے ایک یہودی عزیز کے لیے وصیت کی تھی۔ (دارمی، کتاب الوصایا، ج ۲، ص ۸۱۷) حضرت عکرمہؓ کی ایک روایت میں ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت صفیہؓ نے اپنا ایک مکان حضرت معاویہؓ کو ایک لاکھ میں فروخت کیا۔ انھوں نے ایک عزیز سے، جو یہودی تھا، کہا کہ اگر تم اسلام لے آؤ گے تو میرے وارث ہو جاؤ گے، لیکن اس نے ان کی بات نہیں مانی۔ پھر انھوں نے اس کے نام وصیت کر دی۔ بعض لوگوں کے بیان کے مطابق وصیت تیس ہزار کی تھی۔ (عبدالرزاق، ج ۶، ص ۳۳)

امام شعبیؒ کہتے ہیں: "مسلمان نصرانی کو وصیت کر سکتا ہے۔" (ایضاً، ص ۳۳) ابن جریج کہتے ہیں: "میں نے حضرت عطا بن رباحؒ سے سورۂ احزاب کی آیت کے اس فقرہ، الا ان تفعلوا الی اولیاء کم معروفا (مگر یہ کہ تم اپنے اولیاء کے ساتھ بھلائی کرو)، کے بارے میں دریافت کیا کہ اس سے کیا مراد ہے۔ فرمایا، عطا اور بخشش مراد ہے۔ میں نے کہا کہ کیا وہ بخشش جو ایک مومن اپنے کافر قرابت داروں کو کرتا ہے؟ انھوں نے کہا، ہاں۔ زندگی میں وہ جو اسے دیتا ہے، اور اپنے بعد اس کے لیے جو وصیت کرتا ہے۔" (ایضاً، ص ۳۴)

حضرت قتادہؒ سے اس فقرہ کی تشریح ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے: "ہاں، اس کی اجازت ہے کہ تمھارا کوئی قرابت دار جس کا دین تمھارا دین نہ ہو، تم اس کے لیے وصیت کرو۔ وہ رشتہ کے لحاظ سے تمھارا اولی ہے، دین کے لحاظ سے ولی نہیں ہے۔" حضرت حسن بصریؒ نے بھی اس کی یہی تشریح کی ہے۔ (ایضاً، ص ۳۴) محمد بن حنفیہؒ کہتے ہیں: "یہ آیت اس سلسلہ میں نازل ہوئی ہے کہ مسلمان یہودی اور نصرانی کو وصیت کر سکتا ہے۔" (قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۱۲۶/۱۴)

اسلام چاہتا ہے کہ غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ سماجی تعلقات رکھے جائیں اور ان کے ساتھ محبت، ہمدردی اور تعاون کا رویہ اختیار کیا جائے۔ اس کا ایک ذریعہ، تحفے تحائف دینا ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ سے ملتا ہے۔ رسول اکرمؐ نے حضرت عمرؓ کو ایک ریشمی جوڑا بطور تحفہ بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ ریشم کے استعمال سے تو آپؐ نے (مردوں) کو منع فرمایا ہے، پھر یہ مجھے کس لیے عطا ہوا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، یہ اس لیے نہیں ہے کہ تم اسے پہنو بلکہ اس لیے

ہے کہ کسی اور کام میں لاؤ' کوئی دوسرا فائدہ اٹھاؤ۔ حضرت عمرؓ نے یہ جوڑا اپنے ایک (اخیافی) بھائی کو، جو مشرک تھے 'تحفہ میں بھیج دیا۔ (بخاری، کتاب الہبہ۔ مسلم کتاب اللباس)

اس حدیث کے ذیل میں امام نووی ؒفرماتے ہیں: "اس سب میں دلیل ہے اس بات کی 'کہ کافر قرابت داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور ان کے ساتھ حسن سلوک جائز ہے۔ اس میں کفار کو ہدیہ اور تحفہ بھیجنے کا جواز بھی موجود ہے۔" (شرح مسلم' ج ۵' ص ۳۹)

فقہا نے لکھا ہے کہ کوئی غیر مسلم بیمار ہو جائے تو اس کے مسلمان رشتہ دار کو اس کی عیادت اور خدمت کرنی چاہیے' اس کے جنازہ میں شرکت میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت عطا بن رباح ؒکہتے ہیں: "اگر مسلمان اور کافر کے درمیان قریبی رشتہ داری ہے تو مسلمان کو کافر کی عیادت کرنی چاہیے۔" (عبدالرزاق، ج ۶' ص ۳۵) اسی طرح فرماتے ہیں: "اگر قریبی رشتہ داری ہے 'تو مسلمان اور کافر کے درمیان' تو مسلمان کو کافر کے جنازہ میں شریک ہونا چاہیے۔" (ایضاً، ص ۳۶)

فقہ حنفی کی معروف و مستند کتاب ہدایہ میں ہے: جب کسی کافر کا انتقال ہو جائے اور اس کا ولی و سرپرست مسلمان ہو تو وہ اسے غسل دے گا اور تجہیز و تکفین کرے گا۔ (ج ۱' ص ۱۶۱)

غیر مسلم پڑوسیوں سے تعلقات

انسان کا عموماً سب سے قریبی تعلق اس کے پڑوس سے ہوتا ہے۔ یہ تعلق جتنا مضبوط ہو وہ اتنا ہی سکون اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہ یقین ہو کہ پڑوسی اس کے لیے خطرہ نہیں ہے' اس سے اسے کوئی نقصان اور گزند نہیں پہنچے گا بلکہ اس کی جان مال اور عزت و آبرو محفوظ رہے گی' اور وہ اس کے دکھ درد اور آسایش و راحت میں شریک ہو گا' تو وہ یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ کاروبار حیات میں اپنی ذمہ داری ادا کر سکتا ہے۔ ورنہ وہ سخت دشواریوں سے گزرے گا۔ اسلام نے انسان کو بہترین پڑوسی بننے کی تعلیم دی ہے۔ رسول اکرم ؐکا ارشاد ہے: "جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے' اسے اپنے پڑوسی کو اذیت نہیں پہنچانی چاہیے۔" (ابوداؤد، کتاب الادب)

حضرت ابوذر غفاری ؓکہتے ہیں کہ میرے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ سے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ جب سالن پکاؤ تو پانی بڑھا دو' اور اپنے پڑوسیوں میں سے جس کے گھر ضرورت ہو' اس میں سے کچھ اسے بھیج دو۔ (مسلم، کتاب البر)

پڑوسیوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم عام ہے' مسلمان پڑوسی کی طرح غیر مسلم پڑوسی بھی اس کے مستحق ہیں۔ صحابہ کرام نے اس تعلیم سے یہی سمجھا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ہاں بکری ذبح ہوئی۔ آپ نے گھر والوں سے دو بار

دریافت کیا کہ ہمارے فلاں یہودی پڑوسی کو اس میں سے کچھ بھیجا ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جبرئیل مجھے پڑوس کے سلسلہ میں اس قدر تاکید کرتے تھے کہ مجھے خیال ہوتا تھا کہ وہ اسے وارث نہ بنا دیں؟ (ابو داؤد، کتاب الادب)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفس نفیس ایک غیر مسلم پڑوسی کی عیادت کی ہے۔ حضرت انس ؓ کی روایت ہے: آپ ؐ بنو نجار کے ایک شخص کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ (اس دوران) اس سے کہا، اے ماموں، آپ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیجیے۔ اس نے کہا کہ میں ماموں ہوں یا چچا؟ آپ ؐ نے فرمایا، نہیں ماموں ہیں۔ (اس لیے کہ آپ کی والدہ حضرت آمنہ کا تعلق مدینہ سے تھا)۔ اس نے کہا کہ کیا لا الٰہ الا اللہ کا کہنا میرے حق میں بہتر ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا، ہاں۔" (مسند احمد، ج ۳، ص ۱۵۲)

حضرت انس ؓ ہی کی روایت ہے: "ایک یہودی لڑکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا۔ وہ بیمار ہوا تو آپ ؐ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس کے سرہانے بیٹھے۔ اس سے کہا کہ تم اسلام لے آؤ۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو اس کی قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے کہا ابو القاسم کی بات مان لو، چنانچہ وہ اسلام لے آیا۔ نبی وہاں سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ اللہ کا شکر ہے، اس نے اس بچہ کو جہنم سے بچالیا۔" (بخاری، کتاب الجنائز)

ان روایات سے مشرکین اور یہود کی عیادت کا ثبوت ملتا ہے۔ اسلام کا پیش کرنا تو خیر خواہی کا تقاضا ہے۔ آدمی جسے حق سمجھے، اسے وہ ہر حال میں پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔ فقہا نے رسول اکرم ؐ کے اس اسوہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ غیر مسلموں کی عیادت اور تعزیت جائز ہے۔ اس میں از روئے شرع کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے: "یہودی اور نصرانی کی عیادت میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ یہ ان کے حق میں ایک طرح کی بھلائی اور حسن سلوک ہے، اس سے ہمیں منع نہیں کیا گیا ہے۔ (ج ۴، ص ۴۷۲) درمختار میں ہے کہ، اس بات پر اجماع ہے کہ ذمی کی عیادت جائز ہے مجوسی کی عیادت کو بھی صحیح قول کے مطابق جائز قرار دیا گیا ہے۔ (ج ۵، ص ۳۴۱)

اسی طرح تعزیت سے بھی منع نہیں کیا گیا ہے، بلکہ کہا گیا ہے کہ کسی یہودی یا مجوسی کے بچہ کا انتقال ہوجائے، تو اس کے مسلمان پڑوسی کو اس کی تعزیت کرنی چاہیے، اور کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے بہتر جانشین عطا فرمائے اور آپ کے حالات کو بہتر بنائے۔ (ایضاً)

یہ ہے اس رویہ کی ایک جھلک جسے غیر مسلموں کے سلسلہ میں اپنانے کی قرآن و حدیث نے تعلیم دی ہے اور جس کی قانونی اور اخلاقی حیثیت سے ہمارے علما و فقہا نے بحث کی ہے۔

(جاری)

سائنسی فکر کا ارتقا

پروفیسر عبد القدیر سلیم

برے آن اے پل یارڈ (Brayan Appleyard) نے اپنی فکر انگیز کتاب 'عہد جدید کی تفہیم (Understanding the Present) میں سترہویں صدی کو جدید سائنس کا نقطہ آغاز بتایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ گلیلیو سے پہلے کا زمانہ اور اس کے بعد کا عہد' جوہری اور اساسی طور پر مختلف ہیں۔ ہم' جب جدید عہد اور جدید سائنس کی بات کرتے ہیں' تو ساتھ ہی یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ موجودہ سائنسی ترقی' فہم و ادراک انسانی کی کسی اچانک کروٹ کے نتیجے میں ظہور پذیر نہیں ہوئی' بلکہ یہ تین' چار ہزار سال کے فکری ارتقا کا منطقی نتیجہ ہے۔ اے پل یارڈ اس سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ سائنسی فکر' جس کے نتیجے میں نئی دنیا ظہور میں آئی ہے' قدیم اور کلاسیکی سائنسی فکر سے بالکل مختلف ہے۔ اور ان کے پاس اس دعوے کے لیے دلیل بھی ہے۔

اس دعوے کا جائزہ لینے سے پہلے بہتر ہو گا کہ ہم روایتی سائنسی فکر پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیں۔

فلسفیانہ اور سائنسی فکر

کائنات کی حقیقت' انسان کی ماہیت' اس کے آغاز و انجام اور دوسری موجودات کے ساتھ اس کے تعلق کے حوالے سے' پیغمبرانہ بصیرت اور الہامی ادراک کے علاوہ' ہمیں انسانی فکر کی تاریخ میں دو نقطہ ہائے نظر اور ملتے ہیں: فلسفیانہ اور سائنسی۔

فکر انسانی کی تاریخ میں فلسفہ اور سائنس کا آغاز کچھ الگ الگ راہوں پر نہیں ہوا تھا' بلکہ ابتداء تو ان میں کوئی تمیز بھی نہیں کی جاتی تھی۔ اب سے کوئی تین سو سال پہلے تک سائنس کو "فلسفہ فطرت" (Natural Philosophy) ہی کا نام دیا جاتا تھا۔ ان کے دائرے اگرچہ ایک دوسرے کی حدود میں بے تکلفی سے داخل ہو جاتے تھے' تاہم یہ کچھ امتیازی نشانات بھی رکھتے تھے۔ سائنس کا بنیادی کام یہ معلوم کرنا تھا کہ حواس کی مدد سے جو دنیا اور کائنات ہمارے فہم کی رسائی میں آتی ہے' اس کی بنیادی

ماہیت کیا ہے' اور آیا وہ کسی قوانین کی تابع بھی ہے؟ اور اگر ہے' تو وہ قوانین کیا ہیں؟ فلسفے نے بھی کم و بیش انھی سوالات کا ابتدائی جواب دینے کی کوشش کی' مگر' جیسا کہ ہم دیکھیں گے' اس کا طریق کار مختلف تھا۔ فلسفے کا طریق' بنیادی طور پر تفکر کا تھا' جب کہ سائنس کا مشاہداتی۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ تقسیم بھی بعد کی ہے۔ آج جو فلسفے اور سائنس کی تواریخ ہمارے ہاں پائی جاتی ہیں' ان میں دونوں کی ابتدا یونان میں وجودیات (Ontology) اور کونیات (Cosmology) کی تفتیش و تحقیق اور بحثوں سے ہوتی ہے۔

حقیقت کائنات کی جستجو

مغربی ایشیا اور یونان میں جہاں اب سے ڈھائی ہزار سال پہلے بعض لوگوں نے اپنے روز مرہ کے مشاغل سے آگے کی بات کی' اور کائنات کو سمجھنے کے لیے عقل کو حَکَم بنانے کی کوشش کی' ان میں پہلا نام طالیس (Thales' م ۵۴۶ ق م) کا آتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ کائنات کی تفہیم میں پہلا قدم یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ دنیا بنی کس چیز سے ہے؟ اس کے بعد ہی ہم اس کے قوانین دریافت کر سکتے ہیں۔

کائنات کے بنیادی مواد کی تفتیش میں وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ پانی (آب) ہی وہ بنیادی عنصر ہے' جس سے ساری چیزیں بنی ہیں مگر پانی ہی کیوں؟ اس کے خیال میں بنیادی عنصر ہونے کے دوسرے دعوے داروں (خاک' باد' آتش) کے مقابلے میں آب میں یہ امتیازی وصف پایا جاتا ہے کہ وہ مادے کی تینوں حالتیں آسانی سے اختیار کر لیتا ہے۔ اپنی عام حالت میں تو وہ مائع ہے' بہت سرد ہو جائے تو ٹھوس (برف) بن جاتا ہے' اور شدید حرارت کے تحت گیس (بخارات) کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بعد کے شارحین نے طالیس کے دعوے کے لیے کچھ اپنی قیاس آرائیوں کا بھی سہارا لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی ابتدائی جوانی میں اس نے مصر کا سفر بھی کیا تھا' وہاں اس نے دریائے نیل میں طغیانی کے بعد دریا کے کناروں پر تازہ مٹی کی تہیں جمتی دیکھیں۔ اس نے سوچا کہ ساری زمین اور چٹانیں شاید اس طرح (پانی سے) پیدا ہوئی ہیں۔ پانی' مٹی بھی بن جاتا ہے اور چٹان بھی۔ بیسویں صدی میں جب علمائے فلکیات نے یہ معلوم کر لیا کہ کائنات میں کثیر ترین عنصر ہائیڈروجن ہے' تو انھوں نے کہا' واہ! طالیس پر تو یہ حقیقت ڈھائی ہزار سال پہلے ہی منکشف ہو گئی تھی۔

مگر انیکسی مندر (Anaximander) کا خیال تھا کہ یہ بے انصافی کی بات ہے کہ "عناصر اربعہ" میں سے ایک ہی کو بنیادی قرار دیا جائے' اور دوسروں کو ثانوی بنا دیا جائے۔ اس نے خیال

ظاہر کیا کہ دنیا، چاند، سورج اور ستارے سبھی ایک ایسے نامعلوم مواد (مادے) سے بنے ہیں، جو ابتداء میں تمام کائنات پر محیط تھا، پھر منجمد ہو کر اس نے اجرام سماوی کی شکل اختیار کر لی۔ مگر اس کے بعد انیکسی منیز (Anaxemenes) نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کا مشاہدہ تھا کہ کائنات میں ہوا (باد) ہی ''عناصر اربع'' میں سب سے زیادہ وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔ یہ ٹھنڈی ہو کر پانی کے قطروں کی صورت میں ترشح کرتی ہے، گرم ہو کر بھاپ اور شعلے کی لپک کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور منجمد ہو کر ٹھوس برف اور مٹی بن جاتی ہے۔

دو ''عناصر'' (آب، باد) کے بعد اب تیسرے عنصر ''آتش'' کی باری تھی۔ ہیراقلیطس (Heracletus) م ۵۷۰ ق م) نے براہ راست مواد کائنات کی تلاش تو نہ کی، تاہم اس کی دلچسپی اس بنیادی اصول میں تھی، جو کائنات میں جاری و ساری ہے، اور اس نے یہ اصول ''حرکت'' اور ''تغیر'' میں تلاش کر لیا۔ حقیقت غائی (Ultimate Reality) کیا ہے؟ ایک تغیر مدام، ایک حرکت سکون نا آشنا۔ ع

بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے
کہتے ہیں جسے سکوں، نہیں ہے

اور اس تغیر مسلسل کو کسی عنصر سے ظاہر کیا جا سکتا ہے، تو وہ ہے شعلہ آتش، جو دائم حرکت میں رہتا ہے، جو شے ایک لحہ تیل اور ایندھن تھی، اب شعلہ ہے، اور جو شعلہ تھا، وہ دھوئیں اور ہوا میں تحلیل ہو چکا۔

مگر فکر مغرب میں جو بات ہیراقلیطس کو دوسرے فلسفیوں / سائنس دانوں سے ممتاز کرتی ہے، وہ یہ کہ اس نے اخلاقی اصولوں کی بنیاد، مادی و حسی فکر کے بجائے، مابعد الطبیعاتی فکر میں تلاش کی۔ کیونکہ آگ 'ایک ''بے لوث'' عنصر ہے۔ پاک اور پاک کر دینے والی' یہی ہماری اور کائنات کی اصل ہیں۔ یہ خشک ہے، اور خشک کر دینے والی ہے، لہٰذا خود کو ''تر دامنی'' سے بچاؤ۔ ''اپنی روح کو خشک رکھو، کیوں کہ خشک روح ہی بہترین ہے۔'' گناہ کی زندگی کے لیے ''تر دامنی'' اور پاکیزگی کے لئے ''زہد خشک'' (جس کا ہمارے شاعر مذاق اڑاتے ہیں) شاید ان علامتی اظہارات ہی کا نام ہے۔ مغربی فکر کی اساس یونان ہے، اور یونان میں ہیراقلیطس غالباً پہلا مفکر ہے جس نے انسان کی زندگی میں پاک بازی کی طرف توجہ دلائی۔

مگر اس سے پہلے ایشیائے کوچک (جزیرہ ساموز) میں فیثا غورث (م ۵۰۶ ق م) مروج یونانی اصنام پرستی کے خلاف حلقہ بندی کر چکا تھا۔ اپنے ہم عصروں میں وہ ایک دانا اور پرہیز گار انسان کی

حیثیت سے معروف تھا۔ دانائی کا تقاضا ہے کہ انسان حیوانی خواہشات کو لگام دے، اور حیوانی سطح سے بلند ہونے کی کوشش کرے۔ "خیر" اور "شر" کے تصورات کو تفکر کا موضوع بنانے والا وہ پہلا "مغربی ایشیائی" تھا، اور اپنے حلقہ ارادت میں شامل ہونے والوں کے "تزکیہ" کے لیے فکرمند بھی۔ اس کے نزدیک 'تزکیہ' کی پہلی شرط یہ تھی کہ ہر قسم کے لاگ اور لگاؤ (لوث) سے انسان خود کو آزاد کرلے۔ علم، حکمت اور دانائی کی تلاش، کسی فائدے اور نفع کی خاطر نہ ہو، بلکہ یہ خود اپنی غایت ہوں۔ اعداد اور علم الاعداد اس کے نزدیک انسان کی اس بے لوث زندگی کی طرف رہ نمائی کرسکتے ہیں۔ دوسرے تمام علوم (تجارتی، آہن گری، طب، تجارت اور تعمیر کا علم) کسی فائدے اور نفع کی خاطر سیکھے جاتے ہیں، لیکن اعداد، انتہائی درجے میں "غیر جانب دار" اور "بے لاگ" ہوتے ہیں۔

فیثاغورث کا محاکمہ کرنے والوں میں سے بعض نے اس کی تصویر کشی ایک صوفی صافی کی حیثیت سے کی، جو ایک حلقہ مریداں میں بیٹھا انھیں اسرار اعداد بتا رہا ہے۔ دنیا و مافیہا سے بے رغبتی کی تلقین کر رہا ہے، اور دوسری طرف اسے جدید سائنس کا خواب دیکھنے والا بتایا جاتا ہے، جو ہر شے کو اعداد کی صورت ہی میں دیکھتی ہے۔ ریاضی کو تجارت کے حساب کتاب کی تنگ دنیا سے نکالنے والے اس عبقری کو اس سے زیادہ خراج تحسین کیا پیش کیا جاسکتا ہے کہ آج ساری کی ساری حیات کو ایک کیمیاوی عمل قرار دے دیا گیا ہے، کیمیا خود طبیعات بن گئی ہے، اور طبیعات کا خلاصہ ریاضی کے ہندسوں اور علامتوں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا۔

مادیت کا دھارا

مغربی فکر میں دو منفرد دھارے ساتھ ساتھ رواں نظر آتے ہیں۔ ایک تو یونانی بت پرستانہ مادی فکر ہے، جس کا پہلا اظہار ہم طالیس کے ہاں دیکھ چکے ہیں۔ اسے دیمقراطیس (Democritus) نے فروغ دیا، اور بعض مورخین فلسفہ تو اسے مادیت (Materialism) کا جد امجد قرار دیتے ہیں۔ دوسرا دھارا مادے اور مادی، حسی مظاہر سے بلند ہوکر حقیقت کی تلاش کا ہے۔ اس رجحان کا آغاز فیثاغورث میں تلاش کیا جاسکتا ہے، لیکن، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، یونان ہی اس کی گل افروزی سقراط کی فکر میں ہوتی ہے، وہاں سے یہ روایت افلاطون، کانٹ، شوپن ہائر، بریڈلے اور دوسروں تک پہنچتی ہے۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ دیمقراطیس کے پیش رو لیوسی پس (Leucippus) ہی نے ان نظریات کی بنیاد رکھ دی تھی، جن کو دیمقراطیس سے منسوب کیا جاتا ہے، اور ایک طرح سے سیکولر نظریہ حیات اور بے خدا نظریہ کائنات کی بنیادیں رکھنے والا یہی ہے۔

لیوسی پس نے کائنات و مافیہا کو دو "اصولوں" سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ "ایٹم" یا "ذرات" جو "وجود" کی نمائندگی کرتے ہیں، اور "خلا" جو "عدم" کا مظہر ہے۔ اس طرح کائنات وجود مادی اور عدم وجود یا لاشئے پر مشتمل ہے۔ ذرات (یونانی atomos) وہ ناقابل تقسیم مادی وجود ہیں، جن سے زیادہ سادہ یا ابتدائی وجود کا تصور نہیں کیا جاسکتا، تاہم یہ جسامت میں یکساں نہیں بلکہ چھوٹے بڑے ہیں۔ یہ مختلف الاشکال ہیں، اور تعداد میں لاتناہی۔ یہ "خوردبینی" اجزا آنکھ سے نہیں دیکھے جا سکتے، تاہم دنیا کی ساری چیزیں انھی سے مل کر بنی ہوئی ہیں۔ ان اجزا کے اتحاد سے چیزیں تخلیق ہوتی ہیں، یہ منتشر ہو جائیں تو فنا ہو جاتی ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ ذرات یا "جواہر" (جوہر کی جمع) نہ تو پیدا ہو سکتے ہیں، اور نہ فنا ہو سکتے ہیں۔ گویا یہ خدا ہیں۔

اگرچہ لیوسی پس کی تحریریں موجود نہیں ہیں، لیکن کہا جاتا ہے کہ اس نے تکوین و حوادث عالم میں اتفاق محض (chance) کا انکار کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر چیز سے بندھے قوانین فطرت کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ ہر واقعہ کچھ اسباب کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ (نظریہ لزوم جبریت)، جن کی موجودگی میں نتیجہ دوسرا نہیں ہو سکتا۔

بیسویں صدی کے شروع میں جب عظیم جرمن عالم طبیعیات ہائزن برگ (Heisenberg) نے "اصول لایقین" (Principle of Uncertainty) پیش کیا، جس کے مطابق زیر ایٹمی ذرات (sub-atomic particles) کی حرکت اور مقام کا تعین نہیں کیا جاسکتا، گویا کائنات میں کوئی چیز یقینی نہیں (عدم جبریت)، تو آئن اسٹائن چیخ اٹھا: "خدا پانسہ نہیں کھیلتا" (God does not play dice) پانسے پھینکنا ایک اتفاقی اور غیر یقینی فعل کی عکاسی کرتا ہے۔ ہائزن برگ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا: "خدا کو مت کہو کہ وہ کیا کھیلے کیا نہ کھیلے"۔

بہرحال مادیت اور مادی جبریت کا قدیم یونانی ہیرو دیمقراطیس (م ۳۷۰ ق م) ہی ہے جس نے بہت کچھ تحریر میں چھوڑا ہے۔ اس نے لیوسی پس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا: ذرات، جوہر یا ایٹم جو ناقابل تقسیم ہیں ہمیشہ سے ہیں، اور ہمیشہ رہیں گے (بقائے مادہ کا نظریہ)۔ یہ اگرچہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے یکساں ہیں، تاہم ان میں کچھ بڑے (اور وزنی) ہیں، اور کچھ چھوٹے (اور ہلکے)، کچھ کھردرے اور ناہموار ہیں، اور کچھ چکنے اور ہموار۔ چوں کہ "کند ہم جنس باہم جنس پرواز" اس لیے ایک جیسے ذرات باہم ملنے کی کوشش کرتے ہیں، اور ناجنس ایک دوسرے سے بچتے جاتے ہیں۔ اسی عمل سے حرکت ظہور پذیر ہوتی ہے اور کائنات میں حرکت و تغیر کی وجہ یہی ہے۔ حرکت، تغیر، تشکیل اور ارتقا کے لیے ماورائے کائنات کسی اصول یا ہستی کی پیشگی موجودگی فرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

سائنس بھی ۱۸ ویں صدی کے بعد یہی اصول حتمیت کے ساتھ پیش کرتی رہی ہے۔ جب کائنات و مافیہا' اس کے تمام تغیرات ' ان کے عوامل اور اسباب 'خدا کو درمیان میں لائے بغیر سمجھ میں آ سکتے ہیں 'تو پھر اس ''بزرگ ہستی'' کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے؟ دیمقراطیس نے بڑی تفصیل سے بہت سے قدرتی مظاہر جیسے برق' رعد' طوفان' ہواؤں کے چلنے اور زلزلوں کو ''قدرتی عوامل'' کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی۔

مادی فلسفہ کی رو سے 'تمام اشیا کی طرح ''روح'' بھی نہایت باریک اور نفیس ذرات سے تشکیل پذیر ہوتی ہے 'جب کہ اجسام کے ذرات نسبتاً سخت 'کھردرے اور بھاری ہوتے ہیں۔ موت نام ہے روح اور جسم کے ذرات کے ایک دوسرے سے الگ ہو جانے کا۔ ع

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشاں ہونا!

مادیت کے اس نقطہ نظر نے دیمقراطیس کے فلسفہ زندگی کو بھی اسی طرح متاثر کیا' جس طرح جدید سائنس نے جدید اخلاقیات اور عمرانیات کو۔ ہر فرد کے کردار اور عمل کی غایت اور اس کے فلسفیانہ تفحص کا مقصد 'مسرت' خوشی' خوش حالی اور سکون و اطمینان کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور سماجی غایت؟ فطری طور پر یہ انسانوں کے درمیان بہتر تعلقات 'ہم آہنگی 'صلح و آشتی ہی ہو سکتی ہے۔ وہ کام اچھے اور اخلاقاً ''خیر'' ہیں 'جو ان کے فروغ میں ممد و معاون ہوں' اور وہ سب برے اور ''شر'' ہیں جو ان میں رکاوٹ ڈالیں۔ آگے مسرت پرستی لذت پرستی (Hedonism) کی بنیاد ڈالنے والے ارسطی پس (Aristippus) کی فکر کو عام کرنے والا بھی دیمقراطیس ہی ہے۔ بعد میں اپی کیورس (Epicurus' م ۲۷۰ ق م) نے لذت و مسرت کے اخلاقی فلسفے کو عقلی بنیادوں پر مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا' وہ کام اچھے ہیں 'جو مسرت و لذت یا تسکین پر منتج ہوں' اور درد و الم اور تکلیف کے باعث بننے والے افعال' افعال بد ہیں۔ اس مسرت کو اختیار کرو' جس کے بعد کوئی درد نہ لاحق ہو' کم مسرت پر زیادہ مسرت کو ترجیح دو' اس مسرت سے اجتناب کرو' جس کے بعد بڑی تکلیف یا دکھ کا سامنا کرنا پڑے' وغیرہ۔

عہد جدید میں مشہور فلسفی اور معاشیات داں' جان اسٹووارٹ مل (J.S. Mill ۱۸۰۶-۱۸۷۳) نے لذتیت یا مسرتیت کے اس اخلاقی نقطہ نظر کو افادیت (Utilitarianism) کے بھرپور فلسفے میں تبدیل کر دیا۔ اپنے برطانوی ہم وطن جرمی بینتھم (Jeremy Bentham' ۱۷۴۸-۱۸۳۲) کے ساتھ' جس نے مسرت کے احصا کے لیے ایک بڑا تفصیلی پیمانہ پیش کیا تھا' اور

اخلاق کے ساتھ ساتھ قانون سازی میں 'عوام کے فائدہ اور ان کی لذت و مسرت کو خوب و ناخوب اور درست و نادرست کا پیمانہ بنایا تھا۔ مل نے انیسویں اور بیسویں صدی کی اخلاقی' قانونی اور معاشی فکر پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں انگریزوں پر جو "قوم تجار" کی پھبتی کسی گئی ' اس کی تہہ میں ان کا یہی "نفع" اور "فائدے" کا فلسفہ زور آزما نظر آتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ عہد جدید کی دوسری انگریزی بولنے والی قوم جس نے صنعت و تجارت کے ذریعے دنیا کو فتح کرنے کی کوشش کی ' اسی فکر کی ایک زیادہ وسیع صورت کو اختیار کرتی ہے۔ میری مراد امریکہ کے فلسفہ نتائجیت (Pragmatism) اور آلاتیت (Instrumentalism) سے ہے 'جس کے مطابق درست اور صحیح وہ ہے جو نتیجہ خیز ہو 'کار آمد ہو اور جو کام بنا سکے۔

تصوریت

گو مغربی فکر مادیت کی فکر ہے 'مگر اس میں مادیت ــــ حاضر و موجود سے متعلق تفحص ــــ کے علاوہ ایک دوسرا دھارا بھی ملتا ہے 'جو اس سے جوہری طور پر مختلف ہے۔ اس کے وکیل وہ لوگ رہے ہیں جو حقیقت کو ماورائے حواس تلاش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حواس بسا اوقات دھوکا دیتے ہیں ' اور مادہ اور اس کے مظاہر متغیر اور فنا پذیر ہیں 'جب کہ حقیقت کو غیر متغیر اور باقی ہونا چاہیے۔ مغربی فکر میں اس نقطہ نظر نے اکثر "تصوریت" (Idealism) کی صورت اختیار کی۔ اگرچہ اس کا انتہائی نقطۂ عروج اٹھارویں صدی کے برطانوی فلسفی بشپ بارکلے (Bekeley' م ۱۷۵۳ء) کی صورت میں نمودار ہوتا ہے 'لیکن اس کے بعد بھی ہیوم 'کانٹ ہیگل اور بریڈلے کو اسی شاہراہ کے رہرو بتایا گیا ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اس کاروان کے مسافر مادیت کی باد مخالف اور مشاہدہ و حواس کی پیش قدمی کے آگے پسپا ہو رہے تھے اور ایک ہارتی ہوئی جنگ لڑ رہے تھے۔

(جاری)

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیٰحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ

اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے بشارت دینے کے لیے اور
تمہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند بنانے کے لیے۔



یونس میٹل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ
یونس کالونی۔ جی ٹی روڈ گوجرانوالہ فون ۳-۵۲۵۳، ۳-۵۲۵۲
فیکس نمبر: ۹۲-۴۳۳۱-۵۲۱۳۲۷
ٹیلکس نمبر 4590 YUNAS PK
گرام "یونس فینز"

یونس پنکھے
سالہا سال سے پسندیدہ
تربیت یافتہ تکنیکی ماہرین کی
شب و روز محنت کا نتیجہ

ترکی میں اسلامی تحریک

فتح کے دروازے پر!

مسلم سجاد

ترکی میں مارچ ۹۴ کے بلدیاتی انتخابات میں اسلامی قوتوں کی واضح کامیابی اور انقرہ اور استنبول کے "سقوط" نے مغربی دنیا میں خطرہ کی جو گھنٹیاں بجائی تھیں ' ان کی بازگشت تیز ہوتی جا رہی ہے۔ عام انتخابات ابھی دو سال دور ہیں (اکتوبر ۹۶) 'لیکن بنیاد پرستوں 'کی فتح کے خواب پریشان نے مغرب کی نیندیں اڑا دی ہیں' اور ایران اور الجیریا کے بعد 'تیسرا ملک بنیاد پرستوں کی جھولی میں گرتا نظر آ رہا ہے۔

چار دسمبر ۹۴ کو ۲۲ پارلیمانی حلقوں میں ضمنی انتخابات ہونا تھے۔ ان ۲۲ حلقوں میں مارچ کے انتخابات میں رفاہ پارٹی نے ۱۶ بلدیات کا کنٹرول حاصل کیا تھا۔ رفاہ کے ذرائع کے مطابق انھیں ۲۲ میں سے ۱۷ سے ۱۹ تک نشستوں پر کامیابی کا یقین تھا۔ رفاہ کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہی ہوا ہے۔ نجم الدین اربکان کو اعتماد ہے کہ "ہماری کارکردگی دیکھنے کے بعد عوام ہمیں ہی ووٹ دیں گے"۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ حکمراں پارٹیوں کو شریف آدمیوں کی طرح اقتدار چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن سیاست شاید شریفوں کا کھیل نہیں --- حکمراں پارٹیوں نے انتخابی قواعد میں تبدیلی کر کے کسی حلقے میں عارضی طور پر ڈیوٹی پر موجود ملازمین کو اسی علاقہ میں ووٹ دینے کا حقدار قرار دیا۔ پروفیسر اربکان کا کہنا ہے کہ ٹرو پاتھ پارٹی (DYP) مشرقی اناطولیہ کے علاقے میں ۳ ہزار فوجی اور سرکاری ملازمین بھیجنے کی منصوبہ بندی کر رہی ہے تاکہ وہ رفاہ کے خلاف ووٹ دیں۔ دوسری طرف ملک کی دستوری عدالت نے کردوں اور فوج کی کشمکش کی وجہ سے دیہی علاقے سے شہروں میں آنے والوں کو شہروں میں رجسٹریشن کا حق دیا۔ ان میں رفاہ کے متوقع ووٹر زیادہ تھے۔ رفاہ کی کامیابی کے یقین کی وجہ سے یہ انتخابات ہی معرض خطر میں پڑ گئے۔

مغرب کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے شاگرد نہایت نااہل اور بددیانت حکمراں ثابت ہوئے ہیں۔ ترکی

ان کا ایک مثالی مسلم ملک ہے۔ اگر یہاں اقتدار ان کے شاگردوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو یہ "نہ صرف سیکولر ترکی کا اختتام بلکہ اس تصور کا بھی اختتام ہو گا کہ مذہب مغرب کی طرح اسلامی دنیا میں بھی محض اپنی دائرہ میں سکڑ کر رہے۔ (Star fades as crescent rises, by Martin Woollacott, the Guardian, London, 23rd Nov, 1994) اور اکتوبر ۹۶ میں یہ واقع ہو جائے کوئی ایسا بعید از قیاس نہیں بلکہ دیکھنے والوں کو نظر آرہا ہے۔ مارٹن وولاکاٹ نے گارڈین میں ضمنی انتخابات کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کی علامت یہ ہے کہ حکمران پارٹی حواس باختہ ہو کر رفاہ کو فتح سے محروم رنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔ اس کے مطابق رفاہ کے ہاتھ میں کل ووٹروں کا پانچواں بلکہ زیادہ حصہ ہے۔ وہ آئندہ مخلوط حکومت کا حصہ بن سکتی ہے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہی مکمل حکومت بنائے۔ ترکی کے انتخابی قواعد ایسے ہیں کہ ۔۳فیصد ووٹ لینے والی پارٹی حکومت بنا لیتی ہے۔

ترکی کی روایتی سیاسی پارٹیاں ' دائیں بازو کی ہوں یا بائیں بازو کی ' بدعنوانیوں میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ترک عوام ان کا مقابلہ اب ان بلدیات سے کر رہے ہیں جہاں معاملات رفاہ کے ہاتھ میں ہیں۔ دیار بکیر میں کونسل کی روزانہ آمدنی ۳ملین ترک لیرا ہوتی تھی۔ صرف ۲ ماہ میں ۔۵ ملین ہونے لگی۔ قونیہ میں کونسل نے کاروں کا فلیٹ رکھنے کے بجائے ٹیکسیاں اور پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنے کا فیصلہ کر کے خطیر رقم کی بچت کی۔ انقرہ میں پانی کا ٹیکس ۔۵ فی صد کم کر دیا گیا۔ انقرہ میں زیر زمین میٹرو سسٹم تعمیر ہو رہا ہے۔ سابق میئر جن کا تعلق ڈیماکریٹک پیپلز پارٹی سے ہے اب نائب وزیراعظم ہیں ' ۔۶ بلین لیرا کے حساب سے ریل کاریں درآمد کر رہے تھے۔ رفاہ کے میئر پانچ بلین فی کار کے حساب سے مقامی طور پر تیار کروا رہے ہیں۔ رفاہ کے زیر انتظام بلدیات میں روٹی دو ہزار ترکش لیرا میں ملتی ہے۔ جب کہ دوسری جگہوں پر سات ہزار لیرا میں۔ (اس سے افراط زر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اس وقت ۔۱۲فی صد ہے) مقامی سطح پر انتظامیہ کے دیانتدار ہونے سے ہر آدمی کو حالات کی خوشگواری کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے اثرات زندگی کے ہر گوشہ میں محسوس ہوتے ہیں۔ ہم پاکستان میں بھی سوچ سکتے ہیں کہ اگر کل انتظامیہ دیانتدار ہو جائے تو عام زندگی میں کتنی بہتری رونما ہو گی۔ شاید انقلاب کی کیفیت محسوس ہونے لگے۔

نجم الدین اربکان کہتے ہیں کہ موجودہ حکمران ایک کارنر شاپ چلانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے 'کجا یہ کہ ان کے سپرد امور مملکت کیے جائیں۔ وزیراعظم تو رفاہ کی کونسلوں کی آمدنی سے 'امریکی قرضوں کے سود ادا کرنے کا کام انجام دے رہی ہیں۔

اخلاق باختہ 'بدعنوان اور بددیانت حکمران اور انتظامیہ عام آدمی کی زندگی کو جس عذاب میں مبتلا کر

دیتے ہیں' ترک عوام اس سے گزر رہے ہیں' وہ ظلم سے نجات چاہتے ہیں اور ایک عدل کے نظام کے پیاسے ہیں۔ رفاہ ان کے لیے امید کا پیغام لائی ہے۔ آئندہ انتخابات کے لیے رفاہ کا سلوگن عدل کا نظام ہے۔ ترک عدل کے اس نظام کے منتظر ہیں۔

لیکن ترکی کے روایتی سرپرستوں اور ان کے گماشتوں کے لیے یہ ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ یوروپین پارلیمنٹری اسمبلی نے حال ہی میں ترکی میں انسانی حقوق پر ایک رپورٹ میں رفاہ کو "ترکی میں جمہوریت کے لیے خطرہ" قرار دینا ضروری سمجھا۔ جمہوریت کے ان عاشقوں کی منطق بھی خوب ہے۔ عوام کے ووٹ سے خالص جمہوری طریقے سے حکومت ان کے ہاتھ سے نکلنے لگے تو جمہوریت خطرہ میں آجاتی ہے۔ الجیریا میں یہ اپنا حقیقی چہرہ دکھا چکے ہیں پھر بھی جمہوریت کے علمبردار ہیں۔

۱۹۸۰ میں ترکی میں فوجی انقلاب کے بعد' امریکہ نے ہنری کسنجر کو بھیجا تھا جس نے کنعان ایورن اور دفاع اور خارجہ امور کے وزرا کی پیٹھ ٹھونکی کہ تم نے وہ کام کیا جو کوئی جمہوری حکومت نہ کر سکتی تھی۔ اب ۱۹۹۴ میں پھر کسنجر صاحب تشریف لائے' ان کے اعزاز میں تقریب ہوئی جس میں کسنجر نے اپنے سامعین کے خطرات اور اندیشوں کو بھانپتے ہوئے اہم امور میں اشتراک عمل پر زور دیا۔ یقیناً اسلامی بنیاد پرستی کی بڑھتی ہوئی لہروں کو روکنا ترکی کے موجودہ حکمرانوں اور امریکہ کے لیے اہم مشترک امر ہے۔ آئندہ انتخابات میں رفاہ کے اول یا دوم آنے کے خطرے سے نبٹنے کے لیے جو کچھ کرنا ہے' ابھی کرنا چاہیے۔ باخبر رائے کا کہنا ہے کہ کسنجر نے 'غیر سرکاری طور پر' فوجی مداخلت کے امکانات پر بھی بات کی۔ اگر ترک فوج ایسی کارروائی کرے جو ۱۹۶۰ کی جنرل گرسل کی کارروائی (جو عدنان مندریس کی بنیاد پرست حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے کی گئی تھی اور پھر اسے پھانسی دے کر مستقبل کے بنیاد پرستوں کے لیے نشان عبرت بنایا گیا تھا) کے بعد چوتھی مرتبہ ہوگا' تو یہ بعید از امکان نہیں۔ لیکن اب حالات میں بہت فرق واقع ہو چکا ہے۔ ترکی کے فوجی افسران اور اعلیٰ طبقہ یقیناً مغرب زدہ ہے۔ لیکن بوسنیا کے حالات نے سب کو بتا دیا ہے کہ کتنا ہی مغربی بن جائیں' ان کا مسلمان ہونے کا قصور معاف نہیں کیا جا سکتا۔ (دی امپیکٹ انٹرنیشنل' نومبر ۹۴)

مغربی دانشوروں کا ایک سنجیدہ طبقہ' خصوصاً الجیریا کے تجربے کے حوالے سے' اس رائے کا اظہار کر رہا ہے کہ "بنیاد پرست جمہوری جماعتیں" اتنی دہشت گرد بھی نہیں جتنا مغرب کا میڈیا انھیں پیش کر رہا ہے' اگر جمہوری تقاضوں کے تحت ان کا حق انھیں دیا جائے اور حکومت کرنے دی جائے تو کوئی بہتر صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ ترکی کے حوالے سے بھی ۲۳ نومبر کے گارڈین میں مارٹن وولاکاٹ نے لکھا ہے:

"رفاہ کی فتح کے نتیجے میں خانہ جنگی یا فوجی کارروائی ہو سکتی ہے' لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رفاہ حکومت سنبھال لے' لیکن طاقت کا استعمال سنبھل کر کرے۔ اور جب کچھ عرصے بعد ووٹر محسوس کریں کہ رفاہ کے پاس ان کے مسائل کا کوئی طلسمی حل نہیں ہے' تو وہ حکومت چھوڑنے کے لیے تیار ہو۔ یہ وہ بات ہے جو رفاہ چاہتی ہے کہ دنیا مان لے۔ اس سے ترکوں کے اسلامی تشخص کا اظہار بھی ہو گا اور یہ دوسرے مسلمان ملکوں کے لیے احیائے اسلام اور مغربی طرز کی جمہوریت کے درمیان کا راستہ بھی ہے۔"

مغربی تجزیہ نگار مسلمان ملکوں میں اسلامی تحریکوں کی مقبولیت کا سبب ان ممالک کی غربت اور بدحالی کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال سے اگر مغرب کے شاگرد ان ممالک کو اچھی حکومت ہی دے دیتے تو احیائے اسلام کا مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ مارٹن وولاکاٹ کے مطابق' رفاہ کی سیاست فوائد کی تقسیم اور غریبوں کی بہبود پر منحصر ہے۔ اس فارمولے نے اسلامی دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بنیاد پرستی کے لیے لوگوں کے دل جیت لیے ہیں' لیکن یہ تو رشوت ہے۔ رفاہ ترک ووٹروں کے سامنے یہ نیا اور احمقانہ (non sensical) فارمولا پیش کر رہی ہے جس میں اسلام اور خوشحالی کو باہم مربوط کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام کو مسترد کر کے اور مغربی انداز اختیار کر کے وسائل ضائع کیے گئے ہیں۔ اسلام کی طرف رجوع سے خوشحالی کی منزل بھی حاصل ہو گی۔

مارٹن وولاکاٹ رفاہ کی تعلیمی سرگرمیوں کو بھی زیر بحث لایا ہے۔ حکمران سیاسی پارٹیوں کو اپنے ووٹروں کے اسلامی جذبات کی خاطر ائمہ (clerics) کی تربیت کے لیے اسکول کھولنے کی اجازت دینا پڑی۔ رفاہ نے اس رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑے پیمانے پر یہ اسکول کھولے۔ ضرورت کے کسی بھی تصور سے بہت زیادہ ان کی تعداد خوفناک حد تک (monstrously) بڑھ گئی۔ ان اسکولوں کے تیار کردہ نوجوان' اور سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے وہ نوجوان طلبہ اور طالبات جن کی ابتدائی تربیت اسلامی خطوط پر ہوئی ہے' ہر پیشہ میں ایک جتھہ بن گئے ہیں جو رفاہ کے وفادار ہیں اور رفاہی سیاسی کاموں میں آگے آگے رہتے ہیں۔ (شاید اسی لیے پاکستان میں دینی مدارس سرکاری توجہ کا مرکز بن رہے ہیں۔ فرقہ واریت بڑھا کر ان پر ہاتھ ڈالنے کا پروگرام نظر آ رہا ہے۔ دی اسپیکٹ انٹرنیشنل نومبر ۹۴ کے مطابق' حکومت پاکستان نے تعلیم عام کرنے کا مساجد کے استعمال پر مبنی ایک منصوبہ غیر ملکی دباؤ کے تحت ختم کر دیا)۔

مغربی تجزیہ نگار یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ مسلمان' اسلام کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ دیگر اسباب تلاش کرتے ہیں۔ وولاکاٹ کے خیال میں رفاہ کے عروج کا سبب ترکی کا سیاسی' فوجی

اور معاشی بحران ہے۔ شہر، دیہات سے آئے ہوئے لوگوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ غیر مطمئن نوجوانوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ غریب اور امیر کا فرق شاید پہلے سے زیادہ نہ ہو لیکن ٹی وی اور شاپنگ پلازوں نے اس کا احساس بڑھا دیا ہے۔ جو اقدامات معاشی لحاظ سے دانشمندانہ ہیں، سیاسی طور پر حکومت کے خلاف پڑتے ہیں۔ عوام باسانی رفاہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عام آدمی ان اقدامات کو مغرب کے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔ اس طرح بنیاد پرستوں کی فتح کا سیاسی حادثہ (disaster) وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔

برادر مسلم ملک ترکی کے حالات پر ایک معروف برطانوی اخبار کے کہنہ مشق رپورٹر کا یہ تبصرہ ہمارے سامنے ایک تصویر پیش کرتا ہے۔ اسلامی تحریکوں کی عوام میں مقبولیت اور مغربی جمہوری طریقے سے ان کی کامیابی کے امکانات نے مغرب کو متوحش کر دیا ہے۔ ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ ان کی کامیابی کے امکانات کو بڑھا کر اس لیے بھی پیش کیا جا رہا ہے کہ مخالفانہ کارروائی کے لیے راہ ہموار کی جا سکے۔ ان کے تجزیوں میں یہ بات نمایاں ہے کہ ایک جگہ اسلامی تحریک کو کامیابی حاصل ہوئی تو سلسلہ چل پڑے گا۔ افغانستان میں جس طرح حقیقی اور جائز حکومت کے قیام کو روکا گیا اور اس سازش میں جو بھی استعمال ہوا سب کے سامنے ہے۔ الجیریا میں تو کوئی پردہ ہی نہیں رہا۔ بوسنیا کی ریاست کو مٹانے کے لیے جس سطح پر ملی بھگت ہے وہ کوئی چھپی ہوئی نہیں ہے۔ ان حالات کا تقاضا ہے کہ اسلامی تحریکوں کی قیادتیں فراست مومنانہ سے پیش قدمی کریں۔ ایک دوسرے کے حالات اور تجربات سے آگاہی اس کا اولین تقاضا ہے۔ ہمیں اپنوں کے حالات دوسروں کی نظر سے ضرور دیکھنا چاہییں، لیکن رسل و رسائل کے جدید دور میں اس کا موثر انتظام ہونا چاہیے کہ خود اپنے بھی مسلسل آگاہ رکھیں۔

آپ کی توجہ کے لیے

جنوری ۹۵ سے ترجمان القرآن کی قیمت فی شمارہ اور زرسالانہ میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اندرون ملک کی شرح درج ذیل ہے:-

	فی شمارہ:	۱۲/ روپے	زرسالانہ:	۱۲۰/ روپے
بیرون ملک:	مشرق وسطیٰ:	۳۵۰/ روپے	بنگلہ دیش / بھارت:	۳۰۰/ روپے
	یورپ / مشرق بعید:	۴۰۰/ روپے	امریکہ / کینیڈا / آسٹریلیا:	۷۰۰/ روپے

☆ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک نقد / منی آرڈر / بینک ڈرافٹ کے ذریعے رعایتی شرح پر ۱۱۰/ روپے زرسالانہ لیا جائے گا۔

☆ بیرون لاہور کے بنکوں کے چیک وصول نہیں کیے جائیں گے۔

☆ چیک یا ڈرافٹ بنام Monthly TarjmanulQuran ارسال کیجیے۔

مینجر ترجمان القرآن: ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور ۵۴۰۰۰ فون: ۷۵۸۷۹۱۹-۷۵۸۵۵۹۰

سانحہ غزہ

منظر پس منظر

عبد الغفار عزیز

۲۱ جولائی ۱۹۹۳ کو یاسرعرفات کے سیاسی مشیر نبیل شعث کے ساتھ اسرائیلی وزیر خارجہ ماحولیات یوسی سرید نے قاہرہ میں خصوصی مذاکرات کیے۔ ان مذاکرات کے بعد اسرائیل واپس آتے ہی اسرائیلی ریڈیو کو انٹرویو دیتے ہوئے یوسی سرید نے کہا: ''اسرائیلی حکومت کو چاہیے کہ وہ یاسرعرفات کی صدارت میں فلسطینی لیڈرشپ کو تسلیم کرلے کیونکہ بنیاد پرست تحریک حماس کے مقابلے کے لیے یاسرعرفات ہی ہمارا بنیادی حلیف ہے''۔

انھی دنوں میں اسرائیل کی حکمران پارٹی لیبر پارٹی کے جنرل سیکرٹری نسیم زفیلی نے بھی ریڈیو اسرائیل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا: ''فلسطینی نیم خود مختاری کے مجوزہ منصوبے میں اسرائیلی فوج یاسر عرفات کی مکمل حفاظت کا ذمہ لے گی۔ اسرائیلی انتظامیہ کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ معتدل فلسطینی عناصر کو ہرممکنہ مدد دے تاکہ تحریک حماس کو اپنی حدود سے تجاوز کرنے سے باز رکھا جاسکے۔''

۸ ستمبر ۱۹۹۳ کو شائع ہونے والے رسالے کرسچین سائنس مانیٹر کو انٹرویو دیتے ہوئے ڈانی روبنشتائن نے کہا: ''وزیراعظم اسحٰق رابین نے اپنا موقف بنیادی طور پر اس لیے تبدیل کیا ہے کہ بنیاد پرست تیزی سے مضبوط ہوتے جارہے تھے۔ ان بنیاد پرستوں کے خوف کی وجہ سے ہی اسحٰق رابین نے یاسرعرفات کی پی ایل او سے روابط بڑھائے ہیں''۔ اسی رسالے میں ذکریا القاق نامی معروف تجزیہ نگار نے بھی اپنی اس رائے کا کھلم کھلا اظہار کیا کہ اسرائیل حماس کو اپنا دشمن نمبرایک سمجھتا ہے اور اس لحاظ سے اسرائیل اور پی ایل او کا ایک مشترک ہدف یہ ہے کہ حماس کو روکا جائے۔

واشنگٹن پوسٹ کے ایک اور صحافی ڈیوڈ ہوومین نے بھی دیگر بہت سے صحافیوں کی طرح یہی تجزیہ کیا: ''متعدد تجزیہ نگار یہ بات لکھ رہے ہیں کہ اسحٰق رابین کی یاسرعرفات سے معاہدے میں عجلت مجاہد اسلامی لہر کو کمزور کرنے کی خاطر تھی کیونکہ یہی اسلامی لہر امن مذاکرات کی کامیابی کے لیے اصل خطرہ ہے''۔

ان بیانات اور تجزیوں کے سائے میں ۱۳ ستمبر ۹۳ کو بل کلنٹن کے دست شفقت تلے عرفات اور رابین نے غزہ اریحا نامی معاہدہ کیا' تو پوری دنیا میں محبان اسلام کو اپنے قبلہ اول سے دست برداری کا اعلان سننے پر انتہائی کرب محسوس ہوا۔ اور ان کا یہ خدشہ بھی سوا ہو گیا کہ قبلہ اول کی آزادی تک جہاد جاری رکھنے کا عزم رکھنے والی تحریک 'حماس کو اب پہلے سے بھی زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۱۳ ستمبر ۹۳ سے ۱۸ نومبر ۹۴ تک بہت سے ایسے افسوسناک لمحات آئے جن میں یہ خدشات حقیقت بنے 'لیکن ۱۸ نومبر کو فلسطین کے شہر غزہ میں ایک ایسا سانحہ ہوا جس کے سامنے صبرا' شاتیلا' دیریاسین اور مسجد ابراہیمی میں یہودیوں کے ہاتھوں ہونے والی قتل و غارت گری بھی ہیچ نظر آئے۔ اس سانحے کی تفصیلات بتاتے ہوئے حماس کے ایک اہم مرکزی رہنما محمد نزال کہتے ہیں

حماس نے اعلان کیا تھا کہ ۱۸ نومبر کو نماز جمعہ کے بعد غزہ کی مسجد فلسطین سے ایک علامتی جنازہ اس شہید کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے نکالا جائے گا جس نے آپریشن سلام میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی تھی۔ نماز جمعہ کے بعد ہزاروں کی تعداد میں فلسطینی عوام ہشام حمد شہید کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنے کے لیے مسجد فلسطین کے باہر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ لیکن انھیں اس وقت شدید حیرت ہوئی جب جزوی خود مختاری کے نام سے قائم ہونے والی فلسطینی انتظامیہ کی پولیس فورس نے ان مظاہرین کو فوراً منتشر ہو جانے اور جلوس نہ نکالنے کا حکم دیا۔

جب عوام نے منتشر ہونے سے انکار کرتے ہوئے شہید کا علامتی جنازہ نکالنے پر اصرار کیا' تو فلسطینی ادارے کی پولیس نے اپنے ہی فلسطینی بھائیوں پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے نتیجے میں ۱۴ فلسطینی مسلمان شہید اور ۲۰۰ کے قریب شدید زخمی ہو گئے"۔

اس سانحے کی خبر جب غزہ کے دوسرے علاقوں میں پہنچی 'تو علاقہ کے تمام فلسطینی باشندے دیوانہ وار سڑکوں پر نکل آئے۔ اس خونی واردات پر احتجاجی جلوسوں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا جو رات گئے تک جاری رہا۔ بعد میں یہ سلسلہ رفح اور خان یونس تک بھی پھیل گیا۔ ہزارہا افراد نے حماس کی حمایت میں جلوس نکالے۔ زخمیوں میں سے پانچ کی حالت خطرناک تھی۔ ان میں سے ایک زخمی اگلے روز دم توڑ گیا جس سے فلسطینیوں کے ہاتھوں شہید ہونے والے فلسطینیوں کی تعداد ۱۵ ہو گئی۔

اس سانحے کے بارہ میں تجزیہ نگاروں کا سب سے پہلا تاثر یہ تھا کہ گزشتہ دنوں فلسطین میں یہودیوں کے خلاف حماس کے مجاہدین نے متعدد کامیاب آپریشن کر کے نیم خود مختار عرفات انتظامیہ کو یہودی حلیفوں کے سامنے رسوا کر کے رکھ دیا تھا' اور ان کارروائیوں کے بعد یاسر عرفات پر اسرائیل اور امریکا کا یہ دباؤ بہت بڑھ گیا تھا کہ وہ حماس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کا عملی ثبوت دے وگرنہ ۔۔ اور (بقول ڈاکٹر فتحی شفاقی جنرل سیکرٹری تحریک جہاد اسلامی) یاسر عرفات

نے ذاتی طور پر احکامات جاری کرتے ہوئے حماس کا یہ جلوس بزور بندوق کچل دینے کا عملی اقدام کر دیا۔

اس اقدام کا نتیجہ اگرچہ حماس کی مقبولیت میں مزید اضافے اور یاسر عرفات کے خلاف فلسطینی عوام کی نفرت کی صورت میں نکلا ہے لیکن عرفات اور اس کے ہمنوا اسرائیل اور امریکا سے اس قتل عام کی اجرت پانے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔ مصری صدر حسنی مبارک نے ۲۱ نومبر کو لندن میں برطانوی وزیر اعظم جان میجر سے ملاقات کے بعد پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا "فلسطینی نیم خود مختار ادارے کو مغرب کی طرف سے مالی امداد کا نہ ملنا فلسطین میں صورت حال کو گھمبیر بنانے کا سبب بنا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں اگر امن کے اقدامات جاری رکھنا ہیں تو نیم خود مختار ادارے کو بلا تاخیر امداد دی جائے۔" اس سے پہلے ۱۸ نومبر کو (جب غزہ میں قتل عام جاری تھا) لندن میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے حسنی مبارک نے کہا تھا کہ اگر وعدے کے مطابق یاسر عرفات کو ۲ء۲ ارب ڈالر کی امداد نہ دی گئی' تو فلسطین کے بنیاد پرست عناصر وہاں ایک اور افغانستان وجود میں لا سکتے ہیں' اس لیے یاسر عرفات کو فوراً موعودہ امداد فراہم کی جائے"۔

اس سانحے کی سنگینی اور اس پر اپنے اپنے اندازے سے ردعمل کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم رہے گی کہ موجودہ مرحلے میں یاسر عرفات اور حماس دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مزید مسلح تصادم کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یاسر عرفات' تو اس لیے کہ اس سے حماس کی قوت پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھے گی اور خود فلسطینی پولیس کی صفوں میں بغاوت کے امکانات پیدا ہوں گے' اور حماس' اس لیے کہ وہ اسرائیل سے اپنی توجہ کو ہٹنے نہیں دینا چاہتی۔ اسی لیے اس سانحے کے بعد حماس نے اپنے ایک ہنگامی بیان میں اپنے تمام مجاہد نوجوانوں کو یہی ہدایات دی ہیں کہ وہ اس سانحے کا انتقام یہودیوں سے لیں' کیونکہ انھی کی شہ پر عرفات کے مریل ادارے نے یہ اقدام کیا ہے۔ اس موضوع پر ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے محمد نزل کا کہنا ہے: "اسرائیل کے سامنے مضبوط مزاحمت اور فلسطینی نیم خود مختار ادارے سے عدم تصادم ایک مشکل فارمولا ہے لیکن ہمارے سامنے ان خطرناک اور مشکل حالات میں کام کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارا اصل دشمن اسرائیل بے حد سفاک ہے۔ ہم صبر' حکمت اور قربانی کے جذبے سے آگے بڑھتے رہیں گے"۔

خلیل احمد حامدیؒ کی یاد میں

(۱)

قاضی حسین احمد

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات کے بعد یک گونہ تسلی تھی کہ ملک غلام علی صاحب کی صورت میں سید مرحوم کے علمی وارث موجود ہیں۔ ملک صاحب کے فراق کا غم تازہ ہی تھا کہ سید کے ایک اور فکری وارث' مولانا خلیل احمد حامدی صاحب وفات پا گئے۔ یہ تحریک کے لیے دوسرا بڑا صدمہ ہے۔ حامدی صاحب اپنی صحت کے اعتبار سے بھی اس قابل تھے کہ وہ مزید طویل عرصے تک جماعتی خدمات انجام دیتے رہتے' سولہ سولہ اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے مسلسل کام کرنا اب بھی ان کا معمول تھا۔ مختلف اجتماعات میں وہ مسلسل نوٹس لیتے رہتے اور بعد میں انھیں ترتیب دے کر مفید تر بنا دیتے۔ لیکن قدر اللہ و ماشاء فعل۔

حامدی صاحب کی سب سے نمایاں خصوصیت جو ذہن میں آتی ہے' وہ یہ ہے کہ مرحوم نے ابتدائے عمر سے ہی اپنے ذہن کو اس بات پر یکسو کر لیا کہ انھیں زندگی میں اللہ کا کام کرنا ہے۔ پھر اس مقصد حیات کے لیے انھیں جو جو اور جس قدر مواقع نصیب ہوئے انھوں نے ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ انھیں نوجوانی میں معاون دفتر کی معمولی خدمت قبول کرنے میں بھی تامل نہ ہوا۔

ساٹھ کی دہائی میں پہلے مارشل لا کے دوران حامدی صاحب کو بیرون ملک دورے پر بھیجا گیا تو انھوں نے اس سفر کو اسلامی تحریکات سے روابط بڑھانے' جماعت کی دعوت اور حالات سے عالم کو متعارف کروانے اور اپنی عربی کی استعداد کو بڑھانے کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کیا۔ ایک مرتبہ شام کے ایک مکتبہ کے مالک نے مجھے بتایا کہ حامدی صاحب اس دورے کے دوران میں تقریباً تین ماہ تک ہمارے پاس رہے' اور اس عرصے میں اپنی عربی کی استعداد کو بڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔

ذہنی یکسوئی اور فکری ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ انھوں نے مسلسل اور ان تھک محنت کو اپنا شعار

بنائے رکھا۔ حامدی صاحب نے سید مودودی کی فکر کو پورے عالم عرب میں متعارف کروایا، عالم عرب کی اسلامی تحریکات سے اہل پاکستان کو متعارف کرایا، اور اس طرح انھوں نے پاکستان اور عالم اسلام کی تحریکوں اور شخصیات کو ایک دوسرے سے باہم مربوط کر دیا۔ اس ضمن میں مولانا حامدی نے عرب دنیا میں مولانا سید مسعود عالم ندوی اور ان کے بعد مولانا عاصم الحداد کی ڈالی ہوئی بنیادوں پر ہمیشہ قائم رہنے والی ایسی شاندار عمارت تعمیر کر دی ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان اور عالمی اسلامی تحریکات اب یک جان ہو چکی ہیں۔

مولانا حامدی صاحب، عرب ممالک میں تیس سال سے زیادہ عرصے تک کام کرتے ہوئے محنت شاقہ کے ذریعے، اسلامی تحریکوں، اسلامی شخصیات اور اسلامی ممالک کے متعلق اس قدر معلومات حاصل کر چکے تھے کہ وہ اب معلومات کا ایک وسیع انسائیکلوپیڈیا تھے۔ ۵۰ سال میں تیار ہونے والا ایک انسان آج اچانک ہم سے رخصت ہو گیا ہے، تو ایک بہت بڑا خلا نظر آ رہا ہے۔ اگرچہ اس بات میں شک نہیں کہ "ید اللّٰہ علی الجماعۃ"، اللہ تعالیٰ اپنے دین کا کام کبھی رکنے نہیں دیتا، وہی افراد کو اٹھاتا اور ان سے کام لیتا ہے۔

افغانستان کے ایک رہنما مولانا جلال الدین حقانی کا ایک بہت قریبی اور قیمتی ساتھی شہید ہو گیا تو سب لوگ بے حد دلگیر اور افسردہ تھے کہ اب کیا ہو گا۔ مولانا حقانی کہنے لگے کہ دنیا میں بھی اگر کوئی بادشاہ اپنے کسی افسر کا تبادلہ کرتا ہے تو اس کا متبادل کوئی اور انتظام کرتا ہے تو جو پوری کائنات کا بادشاہ ہے وہ اپنے دین کے کام کے لیے کوئی متبادل انتظام نہیں کرے گا؟ اس پر یقین کے باوجود، مولانا حامدی صاحب کی صورت میں ۵۰ سال کا جمع شدہ معلومات و تعلقات کا خزانہ اٹھ جانے پر ہمارے دل افسردہ و ملول ہیں۔

مولانا حامدی صاحب مرحوم کا ایک اور عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے متعدد شاندار ادارے قائم کیے اور کامیابی سے چلائے۔ ان اداروں میں ایک اہم ادارہ سید مودودی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ ہے۔ جس طرح امت مسلمہ ہر رنگ اور ہر خوشبو کے پھولوں کا ایک حسین گلدستہ ہے، اسی طرح سید مودودی انسٹی ٹیوٹ بھی ہر رنگ، ہر زبان اور نسل کے تنوع سے تشکیل پانے والا ایک مربوط و مضبوط اور خوشنما گلدستہ ہے۔ ۱۹۷۹ میں قائم ہونے والے علمی و تحقیقی ادارے، ادارۂ معارف اسلامی نے بھی مولانا حامدی صاحب کی زیر نگرانی متعدد تحریکی و علمی کتب، تالیف، تصنیف، ترجمہ اور طبع کرنے کا قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔

مولانا حامدی صاحب کے توسط سے پاکستان بھر میں متعدد مساجد، مدارس اور مراکز بھی قائم ہوئے ہیں۔ یہ تمام ادارے جماعت کے پاس ایک امانت ہیں۔ یہ صدقہ جاریہ ان شاء اللہ جاری رہے گا، او

جماعت و بزرگان و کارکنان جماعت کے لیے خیر دارین کا موجب بنے گا۔

مولانا حامدی صاحب کی شخصیت کا ایک بنیادی وصف یہ تھا کہ وہ ایک پر امید داعی حق تھے۔ وہ دنیا بھر سے امید کی کرنیں جمع کرتے اور انھیں پاکستان میں لاکر بکھیر دیتے۔ ایک داعی دین کا حقیقی و لازمی وصف ہی یہ ہے کہ وہ مردہ دل' مایوس انسانوں کے دلوں میں امید کی جوت جگا دے' انھیں منزل کی جھلک دکھا کر تیز گام کر دے۔ ان کے دلوں میں کچھ نہ کچھ کر ڈالنے کی امنگ اور جذبہ پیدا کر دے۔ ان کے قلوب میں یہ یقین پیدا کر دے کہ دو قدم آگے بڑھو' منزل تمھارے انتظار میں ہے۔ بال کی کھال اتار کر مایوس کن تجزیے کرنے اور کارکنان میں مایوسی پھیلانے والے لوگ کبھی انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔ انقلابی قائد و کارکنان وہی ہوتے ہیں جو امید کے ایک ٹمٹماتے چراغ کو بھی اپنی پناہ و حصار میں لے کر اس کی لو بڑھانے اور اس چراغ سے مزید چراغ جلانے میں لگے رہتے ہیں' تاکہ پھر ان چراغوں کو بجھانا کسی طوفان کے بس میں نہ رہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ اقبال بھی امید و یقین کی دولت سے مالا مال ہستیاں تھیں جنھوں نے مایوسیوں کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں امیدوں کی نوید سنائی اور کہا کہ

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ایسی شخصیات سے ہماری صفوں کو کبھی خالی نہ ہونے دے یہاں تک کہ قافلہ حق اسلامی انقلاب کی منزل تک جا پہنچے۔

آخر میں ایک اور گواہی دیتا چلوں۔ مولانا حامدی صاحب نے بانی جماعت سید کے ساتھ' پھر محترم میاں طفیل محمد صاحب کے ساتھ بھی' ان کے پورے دور امارت میں' اپنی ذمہ داریاں بحسن و خوبی نبھائیں' اور میرا بھی عمر کے آخری لحات تک ساتھ دیا اور اس طور دیا کہ عمر' تجربے' علم اور عمل میں مجھ سے آگے ہونے کے باوجود سمع و طاعت کا حق ادا کر دیا۔

(۲)

خرم مراد

ہمارا آٹھ روزہ فہم و تدریس قرآن کا کورس ہو رہا تھا۔ خلیل صاحب (رحمہ اللہ) اپنے دل نواز و دل نشیں و دل آفریں انداز میں شام کا لیکچر دے رہے تھے۔ انھوں نے شاگردوں کو (طبرانی کے حوالہ سے) ایک حدیث سنائی: "جو یہ جاننا چاہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اس کا مقام کیا ہے' وہ یہ دیکھے کہ اللہ کا مقام اس کے نزدیک کیا ہے"۔ شاگردوں پر کیا گزری پتہ نہیں' استاد کے دل میں ہلچل مچ گئی' اور اس

میں ایک ترازو نصب ہوگئی۔ مفہوم نیا نہ تھا' الفاظ نئے ضرور تھے کہ یہ حدیث اس سے پہلے نہ سنی تھی مگر یہ تو 'از دل خیزد بر دل ریزد (دل سے بات نکلی ہے دل میں پیوست ہوگئی ہے)' والا معاملہ ہوا تھا۔

اللہ کی مرضی یہی تھی کہ فرشتہ موت خلیل صاحب کو اچانک ہمارے درمیان سے اٹھا کر اس کے پاس لے جائے جس کے پاس اپنا مقام بنانے کی تگ و دو میں وہ آخری وقت تک ہمہ دم وہمہ تن لگے رہے۔ ۲۵ نومبر کو جمعہ کے دن جب فجر کے بعد ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو یہ خیال کیسے آسکتا تھا کہ اب کان ایک ایسے حادثہ پر جانکاہ کی خبر سننے والے ہیں جس کے نقصان کا پورا اندازہ کرنے کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ "بڑی افسوس ناک خبر ہے! مولانا خلیل احمد حامدی آج صبح انتقال فرما گئے ہیں"۔ شعبہ تنظیم کے ناظم' برادرم رشید کی رندھی ہوئی آواز کانوں میں پڑی۔ دل نے ماننے سے انکار کر دیا۔ کچھ انکار' کچھ حیرت' کچھ جھنجلاہٹ' اور کچھ امید کہ شاید یہ الفاظ واپس ہو جائیں' ملے جلے جذبات کے ساتھ میں نے کہا "نہیں بھئی' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! ایسا کیسے ہو سکتا ہے!"۔ "صبح قصور کے قریب ٹریفک کے حادثہ میں زخمی ہوئے اور ہسپتال میں فوت ہوگئے۔ ان کی اہلیہ اور بہو ہسپتال میں ہیں"۔ اب ماننے کے سوا کوئی چارا نہ تھا' امید کے سب تنکے ٹوٹ گئے' فراق کی مقدر گھڑی آچکی تھی' کسی خواہش' کسی جھاڑ پھونک سے اللہ کے فیصلہ کو ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے ہارے ہوئے دل کے ساتھ ریسیور رکھ دیا۔

اب تو ایک ہی چارا تھا اور وہ صبر۔ جو یقین صبر کا سرچشمہ ہے' وہ الفاظ کے قالب میں زبان پر جاری ہوگیا۔ انا للّٰہ و انّا الیہ راجعوْن۔ اللّٰھم آجرْنا فی مُصیبتنا' وعوِّضْنا خیرً امنْھا، للّٰہ ما اخذ ولہ ما اعطٰی و کلّ شئیٍ عندہٗ بمقدار۔ میرے اللہ' ہماری مصیبت کا پورا اجر دے' ہمیں ان کا نعم البدل عطا کر' اللہ ہی کا تھا جو اس نے لے لیا اور دیا بھی اسی نے تھا' اور ہر چیز کے لیے اس کے پاس ایک پیمانہ مقرر ہے۔

میں خلیل صاحب اور ان کی زندگی کے بارے میں بہت کم جانتا ہوں۔ میرا کبھی ان سے سفر حضر میں طویل ساتھ نہ رہا' نہ میں نے ان کے ساتھ کوئی معاملہ کیا' میری ان کے ساتھ تنہائی میں مجلسیں نہیں رہیں' بلکہ اب جبکہ وہ چلے گئے ہیں تو مجھے اپنی اس حرمان نصیبی کا احساس شدت سے ستا رہا ہے کہ میرا تعلق تو ان سے بس واجبی سا تھا۔ یہ ان کی فیاضی' محبت اور لطف و عنایت کا کمال تھا کہ میں اس زعم میں مگن رہا کہ میں ان سے بہت قریب ہوں۔ جو لوگ ان کے بارہ میں کچھ لکھنے کے واقعی اہل ہیں' ان میں میرا نام سب سے آخر میں آئے گا۔ لیکن مشک آہو کا قرب ایک لمحہ کو بھی نصیب ہو جائے' اس سے مس بھی ہو جائے' تو اس کی خوشبو مشام جان کو ہمیشہ کے لیے معطر کیے رہتی ہے۔ کچھ ان کی خوشبو کی مہک' کچھ ان ہی کا پیدا کیا ہوا ان سے قرب کا زعم' بس اسی لیے ان کو یاد کرنے کے لیے بیٹھ گیا ہوں۔

میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ خلیل صاحب اپنے رب کے ایک خطاکار و گناہ گار بندے تھے' جیسے سب انسان ہوتے ہیں' اور ان کو ہونا چاہیے۔ کُلُّکُمْ مُذْنِبٌ۔ وہ ایک ضعیف و کمزور انسان تھے' جیسے سب انسان ہوتے ہیں اور ان کو ہونا چاہیے' خُلِقَ الانسان ضعیفاً-اور مجھے بہت کچھ زیادہ نہیں معلوم' مگر میں یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے رب کے' اس کے کام کے' ایک وفادار بندے تھے' اور ایسے بہت کم انسان ہوتے ہیں۔ وہ اپنی خوئے وفاداری میں اتنے یکسو اور عہد وفا نباہنے میں اتنے منہمک رہتے تھے کہ وفادار بندوں میں بھی ایسے وفادار بس بہت ہی قلیل بلکہ نایاب ہوتے ہیں۔ وفاداری بشرط استواری ہی اصل ایمان ہے' یہ راز خلیل صاحب اچھی طرح پاگئے تھے۔ اللہ کے پاس اپنا مقام بنانے کے لیے انھوں نے اسی وفاداری کو اپنا وسیلہ بنایا' اس کو اپنے دل سے لگاکر رکھا' اسی کو نباہنے میں اپنی ساری تگ و دو لگادی۔ وہ ان چند لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو جماعت اسلامی کے دستور کے اس مطالبہ کی تعبیر بنا لیا تھا: زندگی کی حقیقی ضرورتوں کے سوا ان تمام دوسری مصروفیتوں سے دست کش ہو جانا جو نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں۔

یہی ان کی قوت کا سرچشمہ تھا' یہی ان کی عظمت کا راز ہے' اسی کے بل پر وہ اپنی مختصری زندگی میں اتنے ڈھیر سارے کام کر گئے جن کا تصور بھی میرے جیسے ضعیف آدمی کے لیے ہمت شکن ہے۔ یہی فقیری میں ان کی کل متاع تھی' اسی متاع سے وہ فقیری میں امیر تھے۔

پھر ہم کیوں امید نہ رکھیں کہ خلیل صاحب کا مقام اللہ کے ہاں وہی ہو گا جو ان کے ہاں اللہ کا اور اس کے کام کا تھا۔ وہ اس کے وفادار تھے' وہ ان سے عہد وفا کرے گا۔ انھوں نے اس کے کام کو اپنے دل سے لگاکر رکھا تھا اور جی جان سے کرتے تھے' وہ انھیں اپنے جی میں یاد رکھے گا۔ وہ دنیا کے طول و عرض میں اس کے پیغام کا چرچا کرتے پھرتے تھے' وہ اس دنیا میں' جس میں سارے آسمان اور زمینیں سما جاتیں' یہاں کی مجلسوں سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور پاکیزہ مجلسوں میں ان کا چرچا کرے گا۔ (کما قال اللہ تعالی وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او کما قال)

یہ ۱۹۴۳ کا سال تھا جب خلیل صاحب نے سفر وفا کے لیے قدم آگے بڑھائے۔ اس وقت وہ ۱۴ سال کے تھے' کہ ان کی یادداشت کے مطابق وہ ۲۳ جون ۱۹۲۹' کو ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں حامد میں پیدا ہوئے تھے۔ تاریخ کے اس لمحہ سید مودودی نے دعوت وفا کی جو پکار بلند کی تھی' فیروز پور شہر میں مولوی محمد علی (م ۱۹۸۱' لاہور) اس کے اولین نقیبوں میں تھے' اور انھوں نے ہی خلیل صاحب کو اس کے ذائقہ سے روشناس کیا۔ لیکن یہ بیج جس زمین میں پڑا تھا وہ اسی کے لیے تیار کی جارہی تھی۔

ان کا خمیر ان کے والد' مولانا فتح محمد صاحب کے علم و زہد سے گوندھا گیا تھا۔ بچپن ہی سے رات کو

جب بھی میری آنکھ کھلتی، میں انھیں مصلیٰ پر پاتا"۔ ان کے گھر کی فضا قال اللہ اور قال الرسولؐ کی صداؤں سے گونجتی، اور ان کے ہر طرف دینی کتب کے ڈھیر تھے۔ (یہ انتہائی قیمتی ذخیرہ انھیں بصد حسرت و یاس اپنے گاؤں میں ہی چھوڑنا پڑا، جب وہ ۱۹۴۷ میں پاکستان آئے)۔ راہ وفا سے روشناس ہونے سے پہلے ہی وہ اپنے سینہ کو کلام الٰہی کا مسکن بنا چکے تھے۔ بچپن کی اس تعلیم کے نقوش ان کے نماز کے اہتمام، صف اول میں امام کے عین پیچھے موجودگی، ذکر و فکر میں اشتغال، سفر و حضر میں شش عید کے روزوں کے التزام میں ہر وہ شخص دیکھ لیتا جو ان کے ساتھ ہوتا۔

ایسی زرخیز زمین میں دعوت وفا کا بیج پڑا، تو اس کے برگ و بار لانے میں کیا رکاوٹ ہو سکتی تھی۔ ۱۹۴۳ میں خلیل صاحب دارالاسلام پٹھانکوٹ گئے اور سید مودودی سے ملے۔ ۱۹۴۵ میں پہلے کل ہند اجتماع میں شرکت کے لیے پھر وہاں گئے، اور اپریل ۱۹۴۶ میں الٰہ آباد میں دوسرے کل ہند اجتماع میں بھی شریک ہوئے۔ ۱۹۴۹ میں وہ جماعت کے رکن بن گئے، لیکن ایک سال پہلے ہی جماعت اسلامی لاہور کے دفتر میں معاون کی ذمہ داری قبول کر کے خلیل صاحب ان فقرا کی صف میں شامل ہو چکے تھے جن کی تعریف قرآن نے یوں بیان کی ہے کہ الذین احصروا فی سبیل اللہ (جو اللہ کی راہ میں روک لیے گئے ہیں)۔ اس کے بعد اس صف سے ان کا رشتہ ایسا قائم ہوا کہ اسی وقت ٹوٹا جب انھوں نے قصور کے ہسپتال میں جان، جان آفرین کے سپرد کی۔ وہ اس مقام فقر کے رموز سے خوب آشنا تھے۔ ان کی زبان پر کبھی یہ نہ آیا کہ میں نے تو تحریک کے لیے یہ اور یہ کیا، نہ انھوں نے اس کے عوض خصوصی حقوق کا مطالبہ کیا، نہ زندگی بھر انھوں نے کبھی جماعت سے معاوضہ کی کمی کی شکایت یا اضافہ کی درخواست کی۔ ان کے بیٹے سہیل بتاتے ہیں: ""ابا جان کو ۲۵۰ ملتے تھے، سید مودودی نے طلب کیا تو ۵۰۰ پر حاضر ہو گئے۔ لوگوں نے اس حماقت سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔ ان کا ایک ہی جواب تھا: میرے مرشد نے بلایا ہے"۔

اس عرصہ میں خلیل صاحب نے اور بہت سی وابستگیاں قائم کیں۔ ۱۹۵۵ میں عاصم احداد صاحب کے ساتھ دارالعروبہ سے وابستہ ہوئے، پھر آخر دم تک وابستہ رہے۔ دسمبر ۱۹۶۰ میں پہلی مرتبہ سید مودودی کے ساتھ سعودی عرب گئے، پھر ان کے ساتھ ایسے چمٹ گئے کہ ممکن نہ تھا کہ وہ بیرون ملک جائیں اور خلیل صاحب ہمراہ نہ ہوں۔ آہستہ آہستہ سارا عالم ان کی منزل بن گیا۔ ہمیں تو اگلے شہر جانا بھی دشوار ہو جاتا ہے وہ ہر وقت پابہ رکاب رہتے۔ فسیحوا فی الارض کی تفسیر بن گئے تھے۔ دعوت الی اللہ کی دھن میں وہ کہاں کہاں نہیں پہنچے: شمالی امریکہ سے ملائیشیا تک، سرائیوو اور البانیہ میں، جہاں ضرورت ہوتی وہ موجود ہوتے۔ چند دن پہلے ایک اندرونی قضیہ نپٹانے سری لنکا پہنچ گئے۔ واپسی میں

مالدیپ میں رکے اور تھائی لینڈ کی ہوا بھی کھائی۔ بڑے مزے لے لے کر کہانی سنا رہے تھے۔ ان کے سفرنامے بڑے پرکشش ہوتے تھے۔ سادہ اور سلیس زبان، قیمتی معلومات سے پر، جزئیات و تفصیلات تک درج، غضب کی قوت مشاہدہ اور قوت حافظہ کے مرقعے، دعوت الی اللہ کی خوشبو میں رچے بسے، ہر لفظ میں امیدوں کے چراغ روشن، اور دلچسپ اتنے کہ ختم کرنے سے پہلے ہاتھ سے رکھنے کو دل نہ چاہے۔ پتہ نہیں کب کون ان کے سفرناموں کو پرکھ کر ان کی قدر و قیمت سے دنیا کو آشنا کرے گا۔

کثیر العیال ہونے کے باوجود کثیر السفر تھے اور کثیر السفر ہونے کے ساتھ کثیر المقاصد تھے، نتیجہ خیز مقاصد۔ خلیل صاحب کو ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کی دھن لگی رہتی تھی، وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ ان کے ڈھیر سارے کاموں کی مکمل فہرست بنانا ممکن نہیں۔ دار العروبہ، علمی و تحقیقی کام کے لیے ادارۂ معارف اسلامی، اشاعت کتب کے لیے مکتبہ المنار، بین الاقوامی طلبہ کو داعی اور مجاہد بنانے کے لیے سید مودودی انسٹی ٹیوٹ، بچوں بچیوں کی تعلیم کے لیے منصورہ اور کھڈیاں میں اسکول، تعمیر مساجد پروجیکٹ، حلقات قرآنی پروجیکٹ، امدادی پروجیکٹ، اور نامعلوم کتنے پروجیکٹ۔ جماعت کے بیرونی تعلقات میں تو ان کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی تھی۔

جتنی اچھی عربی لکھتے بولتے تھے وہ کسی خراج تحسین کی محتاج نہیں، لیکن بالآخر انھوں نے ذاتی محنت سے انگریزی میں بھی اتنی استعداد پیدا کر لی تھی کہ بین الاقوامی مجلسوں میں شریک ہوتے، سب کی بات سمجھتے، بس اپنا مدعا عربی میں پیش کرتے۔ زبان سے زیادہ، ان کو جو قدرت، تجزیہ و ترتیب اور اختصار بیان پر حاصل تھی، وہ حیرت انگیز تھی۔ برجستہ بولتے، جھٹ سے نکات مرتب کر لیتے اور خوب بولتے، مرشد کی صحبت کی وجہ سے جمال ہم نشین ان کی تحریر و تقریر میں عیاں ہیں۔ انتقال سے پہلے آخری سفر امیر جماعت کی ہمرکابی میں ایران کا ہوا۔ قاضی صاحب بتاتے ہیں کہ ایک مجلس میں، جہاں بہت سے علماء و اکابر جمع تھے، انھوں نے خلیل صاحب کو وفد کا ترجمان بنا دیا۔ چند منٹ میں انھوں نے سارے نکات ترتیب دے کر، ایک مشکل صورت حال میں، اپنی ساری بات بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کر دی۔ مجھے سفر ایران کی روداد سنانے کا وعدہ کیا تھا، مگر انھیں جانے کی اتنی جلدی تھی کہ وقت ہی نہ ملا۔

علمی و فقہی مسائل ہوں یا تحریکی معاملات، ان کی نظر وسیع تھی، ذہن وسیع تھا، اطراف و جوانب پر نگاہ رکھتے، جدید دور کے تقاضوں کو سمجھتے، حالات کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھتے، کسی سے سیکھنے میں بھی کوئی عار نہ تھا۔ وقت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تحریک کی حکمت عملی میں تبدیلی کے شدت سے قائل تھے۔ سیاحت کی وجہ سے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھے، وسیع الذہنی میں کچھ دخل اس سیاحت کو تھا اور کچھ اس کو بھی کہ انھوں نے اپنی دینی تعلیم کسی ایک مکتب فکر سے بندھ کر

حاصل نہیں کی تھی۔ وہ ندوۃ العلما اور مظاہر العلوم کی تابع جامعہ عظمتیہ کرنال بھی گئے تھے اور مولانا عبدالحلیم قاسمی اور مولانا عبدالعلیم قاسمی (مرحومین) کے مِیل روڈ پر واقع مدرسہ عربیہ بھی۔

وہ وسیع الحلم اور وسیع الذہن ہی نہ تھے، وسیع القلب اور وسیع الظرف بھی تھے۔ آدمی کچھ نہ کرے تو ایک ہی عیب شمار ہوتا ہے، کچھ کرنے لگے تو سوکیڑے نکل آتے ہیں، کچھ صحیح کچھ غلط۔ خلیل صاحب بھی اس سے محفوظ نہ تھے، اس لیے کہ وہ بہت سے کام کر رہے تھے اور بہت سے ادارے چلا رہے تھے۔ کئی دفعہ ان معاملات کا ذکر آیا، نکتہ چینوں کا ذکر بھی آیا، میں گواہی دے سکتا ہوں کہ میں نے کبھی خلیل صاحب کے منہ سے کسی نکتہ چیں کی شکایت نہیں سنی، برائی نہیں سنی۔ جب بھی ذکر ہوا، اچھی طرح یاد کیا، اور جو ان کے لیے کر سکتے ہوں وہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ تعریف کرنے میں کسی بخل سے کام نہ لیتے، بلکہ بڑے فیاض تھے۔ میرے تربیتی کورس ہوتے، سب سے بڑھ کر وہ تعریف کرتے اور اپنے تاثرات کا اظہار کرتے۔ بیرونی سفر سے واپس آتے، وہاں کے لوگوں کے تاثر کے حوالے سے ترجمان القرآن کی تعریفوں کے ایسے پل باندھتے کہ مجھے سخت شرمندگی ہونے لگتی۔

اسی روشن خیالی اور روشن دلی کی وجہ سے ان کے سینہ میں ہمیشہ امید کا چراغ روشن رہتا۔ تحریر ہو، تقریر ہو، مشورہ ہو، مجلس ہو، وہ امید سے لبریز رہتے، مایوسی ان کے پاس بھی نہ پھٹکتی۔ محترم قاضی صاحب نے ان کی یہ خوبصورتی بڑے خوبصورت الفاظ میں بیان کی: "خلیل صاحب دنیا بھر سے امید کی کرنیں اپنے دامن میں بھر بھر کر لاتے اور وہ یہاں بکھیر دیتے"۔

ایک دفعہ ایک قضیہ میں مجھے ثالث بنایا گیا۔ اس سلسلہ میں مجھے خلیل صاحب سے بھی کچھ استفسار کرنا پڑا۔ میں نے ان سے کہہ بھی دیا کہ اسلامی اصولوں کے مطابق، آپ کی طرف سے انکار کافی ہے، بار ثبوت مدعی کے ذمہ ہے۔ مگر وہ کھل گئے۔ اپنی کثیر العیالی کا بتایا، اپنا رہن سہن دکھایا، اپنے اثاثوں کا ذکر کیا۔ یہ سب سن کر میری شرمندگی اور بڑھ گئی کہ آخر میں نے یہ سوال ان سے کیوں کیا۔

انھوں نے اپنے اعمال ہی سے نہیں، اپنی اولاد سے بھی اس کا پورا اہتمام کیا کہ حضورؐ اپنی امت پر فخر کر سکیں۔ ان کے نو بیٹے ہیں: سہیل، عذیر، زید، انس، اسامہ، معاذ، معوذ، ہشام اور محسن۔ انس اپنے باپ اور دادا کی طرح حافظ قرآن ہیں، اور معاذ اور معوذ ۱۸ اور ۲ پارے حفظ کر چکے ہیں۔ پانچ بیٹیاں ہیں: میمونہ، نصیبہ، انیسہ، معاذہ اور شیما۔ دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کی شادیوں سے وہ فارغ ہو چکے تھے۔ جس دن ان کی وفات کا حادثہ پیش آیا، ۳ دن کے بعد زید کی شادی ہونے والی تھی، جو اب بخیر و خوبی انجام پا چکی ہے۔ ان کی اہلیہ ایک نیک خاتون ہیں، جو انتہائی نامساعد حالات کے باوجود، بچوں کی پرورش بھی کرتی رہیں، شوہر کی ہمدم و ہم ساز بھی رہیں۔

ان سب کے درمیان جن کو جماعت نے اپنی خدمت کی ذمہ داریاں سونپی ہیں، خلیل صاحب ایک ایسے فرد تھے کہ کبھی ان کی صحت کے بارہ میں کوئی بات سننے میں نہیں آئی۔ نہ ذیابیطس، نہ دل کا مرض، نہ بلڈ پریشر نہ السر، نہ گٹھیا۔ سنا ہے کہ رات میں ۴ گھنٹے اور دن میں نصف گھنٹہ سوتے اور چاق و چوبند ہو جاتے۔ تعجب ہے کہ وہ سب سے پہلے چلے گئے۔

وہ چلے گئے اس لیے کہ ان کو جانا ہی تھا، کیونکہ قضائے الٰہی نے یونہی طے کر رکھا تھا۔ ورنہ کیا ضروری تھا کہ وہ ۲۴ نومبر کو جمعرات کے دن نصف شب کے قریب اپنی بہو کو لانے کے لیے قصور کا سفر کرتے۔ ایسا کیوں نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے سمدھی کے شدید اصرار پر وہیں ٹھہر جاتے، اور نصف شب کے بعد لاہور کے لیے نہ چل پڑتے۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ ٹرالر اس جگہ نہ ہوتا جہاں وہ تھا، ہوتا تو وہ ڈرائیور کو بروقت نظر آ جاتا، اور نظر نہ آتا تو تصادم کی پوری قوت ان کے سر پر نہ پڑتی۔ انجن ٹوٹ کر اندر دھنس گیا، شیشہ ٹوٹ گیا، سامنے کی سیٹیں پچک گئیں، اور سب سے بڑھ کر خطرہ کی زد میں تو ان سیٹوں پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور (بشارت) اور گارڈ (علی گوہر) تھے، مگر پیچھے کی سیٹ پر گود میں پوتے کو لیے بیٹھے ہمارے خلیل صاحب کو اللہ اپنے پاس بلانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ان کا سر سامنے کی سیٹ سے ٹکرایا اور یہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ بیٹھی تھیں، جن کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی، اور بہو، وہ بھی مجروح ہوئیں۔

قصور کے ہسپتال پہنچے تو چہرہ، داڑھی، کپڑے، سب خون سے لال ہو رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے شہادت کی موت مقدر کر دی تھی۔ اور وہ اس کے اہل بھی تھے کہ انھوں نے ساری عمر جہاد میں گزاری تھی۔ ڈاکٹر بتاتے ہیں کہ آخری وقت انھوں نے بلند آواز سے کلمہ شہادت پڑھا، اور کہا، ذرا مجھے سیدھا کر دو کہ مجھے اب جانا ہے۔

دل گستاخ تو بہت کچھ کہنے کے لیے جوش مارتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا، اگر ایسا ہوتا۔ لیکن زبان میں حکم الٰہی کی لگام پڑی ہوئی ہے: "ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کفر کیا، جب اپنے ان بھائیوں کے بارہ میں، جو سفر یا جہاد کے لیے نکلے، یہ کہا کہ اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے نہ مارے جاتے۔ یہ تو اللہ نے ان کے دلوں کے لیے حسرت کا سامان بنا دیا ہے"۔ (آل عمران ۳: ۱۵۶)

جزع فزع بھی شان تسلیم و رضا کے خلاف ہے، کہ حضور ؐ نے حضرت معاذ بن جبل ؓ کو ان کے بیٹے کی تعزیت کرتے ہوئے خط میں لکھا "ہمارے مال اور ہمارے اہل و عیال، یہ سب اللہ تعالیٰ کے مبارک عطیے ہیں، اس کی سونپی ہوئی امانتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا، تم کو خوشی اور عیش کے ساتھ ان سے متمتع ہونے کا موقع دیا، اور اب اس نے اس اجر کبیر کے عوض اس امانت کو اٹھا لیا۔

پس اے معاذ' ایسا نہ ہو کہ جزع فزع تمھارے اجر کو غارت کر دے اور پھر تمھیں ندامت ہو۔ یقین رکھو' جزع فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا' اور نہ اس سے دل کا رنج و غم دور ہوتا ہے"۔

ہاں' دل کس کے اختیار میں ہے' وہ غم کر سکتا ہے' اور آنکھ کس کے بس میں ہے' وہ رو سکتی ہے۔ اللہ کے حبیب ؐ کے اتباع میں ہم بھی یہی کہتے ہیں

ان العین تدمعُ	آنکھ روتی ہے'
و القلب یحزنُ	دل غم سے گھٹتا ہے'
ولا نقولُ الا مایرضی ربُنا	مگر ہماری زبان وہی کہتی ہے جو ہمارا رب پسند کرتا ہے'
و انا بفراقك ، یاخلیل ، لمحزونون	اور ہم ' اے خلیل ' بیشک تمھارے فراق سے غمگین ہیں۔

کون کس کی تعزیت کرے ' ہم سب ان کے ورثا ہیں۔ آیئے ایک بدو کے اس شعر سے تسلی حاصل کریں' جو اس نے حضرت عبداللہ بن عباس کے سامنے ' ان کے والد ماجد کی تعزیت میں پڑھا تھا:

خیر من عباس اجرك بعده   و اللہ خیر منك للعباس

عباس سے بہتر تمھارے لیے وہ اجر ہے جو ان کے انتقال کے بعد صبر سے تمھیں ملے گا' یعنی اللہ کی معیت۔ اور عباس کے لیے تم سے بہتر وہ اللہ ہے (جس کے پاس وہ گئے ہیں)۔

محمد صلاح الدین

پروفیسر خورشید احمد

برادر محمد صلاح الدین نے ۴ دسمبر ۱۹۹۴ کو بظاہر ایک نامعلوم قاتل کے ہاتھوں گولیوں کی بوچھاڑ میں جام شہادت نوش کیا اور مالک حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

محمد صلاح الدین ایک سچے مسلمان اور ایک سچے پاکستانی تھے۔ وہ ایک بالغ نظر مفکر' ایک صاحب طرز ادیب اور ایک بے باک صحافی تھے۔ قلم کی عصمت اور رائے کی آزادی کے لیے انھوں نے ساری عمر جدوجہد کی' اور اس جنگ میں بالاخر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اسلام پر مکمل ایمان اور اعتماد' امت مسلمہ سے گہری محبت اور عقیدت اور پاکستان کی تعمیر و ترقی کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کا شوق اور عزم ان کی انسٹھ سالہ زندگی کا خلاصہ اور حاصل ہے۔ انھوں نے بڑے نامساعد حالات میں زندگی کے سفر کا آغاز کیا۔ محنت اور مزدوری کے ذریعہ جسم و جان کے رشتہ کو استوار رکھا۔ شب و روز کی محنت سے حصول رزق کی مشقت کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کی' تدریس اور پھر صحافت کو اپنی زندگی کا

مشن بنالیا۔

روزنامہ حریت سے ابتدائی وابستگی کے بعد روزنامہ جسارت کی زمام ادارت سنبھالی، اور تقریباً چودہ سال ایک چوکھی لڑی جس میں "مشق سخن" کے ساتھ ساتھ "چکی کی مشقت" کے سب ہی مراحل سے انھیں گزرنا پڑا۔ جسارت سے رخصت ہونے کے بعد ہفت روزہ تکبیر نکالا جس نے اردو کی ہفت روزہ صحافت میں ایک اونچا مقام حاصل کیا۔ کون سا انسان ہے جس کی آرا سے مکمل اتفاق ممکن ہو، اور بلاشبہ برادرم محمد صلاح الدین کی چند سیاسی و تحریکی آرا سے راقم کو شدید اختلاف رہا، لیکن اسلام سے ان کی محبت، پاکستان اور ملت اسلامیہ کی بھلائی اور بہتری کے لیے ان کی بے چینی اور وارفتگی میں شک کرنا ممکن نہیں۔ ان کے اٹھ جانے سے ملک کی نظریاتی صحافت میں ایک ایسا خلا واقع ہو گیا ہے جس کے بھرے جانے کی فی الحال کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

جان کر منجملہ خاصان مےخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

برادرم محمد صلاح الدین سے ذاتی ربط و تعلق کا رشتہ ربع صدی سے بھی کچھ زیادہ ہی عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ میں نے ان کو ایک سادہ اور شریف النفس انسان پایا۔ ہر دور میں ہمارے درمیان ذاتی تعلقات قریبی اور خوشگوار رہے۔

محمد صلاح الدین کی شہادت صرف ایک شخص کی موت ہی نہیں ایک آئینہ بھی ہے جس میں ایک شہر اور ایک کروڑ انسانوں کے ابتلا کی سچی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ جو ملک اور جو معاشرہ شہریوں کو جان، مال اور آبرو کا تحفظ نہیں دے سکتا، اسے ایک مہذب معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی شہادت سوئی ہوئی قوم کے لیے ایک تازیانہ بھی ہے۔ محمد صلاح الدین کو کسی ذاتی رنجش یا انتقام کی خاطر نشانہ نہیں بنایا گیا۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ پاکستان اور اسلام کی بات کرتا تھا، اور اس ملک کو ظالموں کی گرفت سے نکالنا چاہتا تھا۔ جس ظلم کا وہ نشانہ بنا ہے، صرف کراچی ہی نہیں پورا ملک اس کی زد میں ہے، اور وقت کا تقاضا ہے کہ اس ظلم کے آگے تمام اہل خیر سینہ سپر ہو جائیں تاکہ پاکستان کے بقا کی یہ جنگ فیصلہ کن انداز میں لڑی اور جیتی جا سکے۔ محمد صلاح الدین کامیاب رہا۔ اللہ تعالیٰ اس کی قربانی کو شرف قبولیت سے نوازے، اس کی قبر کو نور سے بھر دے اور اسے جنت کے اعلیٰ مقامات میں جگہ دے۔ این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

TEACHER'S VACANCIES FOR ENGLISH MEDIUM SCHOOL IN PESHAWAR.

Type of Vacenacies	Required Features	Salary
1- Teachers	1- B.A/B.Sc. minimum qualification. 2- B.Ed Preferable. 3- Capability in English Speaking. 4- Teaching experience preferable. 5- Committed muslim in belief and action.	4000-4500
2- Senior Teacher	1- As above mentioned 2- At least 10 years teaching experience in a proper Eng. Medium School.	5500
3- Drawing Teacher	1- F.A. /F.Sc. 2- One year Diploma in drawing. 3- Capability in English Speaking.	3000-3500

Date of interview: *23 and 24 of January 1995.*

Place of interview: *Dar -ur- Rabia and Hajiri Orphan School Pabbi Peshawar Phone No. 229230*

To arrive the above said place please get down the bus coming from Lahore just 1 Km before Pabbi City near Pabbi Girls College. G.T.Road Pabbi (Peshawar)



رسائل و مسائل

میری والدہ کی عمر ۶۵ برس ہے۔ ان کی حج پر جانے کی بہت تمنا تھی۔ اس دفعہ میں نے ان کے لیے درخواست دے دی۔ درخواست دینے کے بعد والد صاحب کا انتقال ہو گیا اور عدت کے ۱۲۰ دن حج کی آخری فلائٹ تک بھی پورے نہیں ہو پاتے۔ کیا کسی طرح سے بھی کوئی گنجائش ہو سکتی ہے کہ ان کی دیرینہ تمنا پوری ہو سکے کیونکہ ان کی صحت بھی دن بدن بہت خراب ہو رہی ہے اور اگلے حج تک شاید جانے کے قابل نہ رہ سکیں' اور پھر شاید محرم کا ساتھ بھی مل سکے یا نہ مل سکے۔

یہ معلوم کر کے صدمہ ہوا کہ جناب کے والد محترم انتقال فرما گئے ہیں۔ اناللہ و انا الیہ راجعون' اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی مغفرت فرمائے اور آپ حضرات کو صبر و اطمینان کی دولت سے نوازے۔ عدت پورا کرنے سے پہلے سفر حج پر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ حج فرض ہو یا نفل' اسی وقت فرض اور نفل ہوتا ہے جب اس سفر پر جانے کی استطاعت ہو۔ لیکن جو عورت عدت میں ہے وہ تجق شوہر اپنے گھر میں محبوس ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "تم میں سے وہ لوگ جو فوت ہو جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ دیتے ہیں' وہ (بیویاں) اپنے آپ کو روکے رکھیں چار مہینے دس دن" (بقرہ ۲۳۴)۔ آپ اپنی والدہ صاحبہ کو عدت پورا کرنے کے بعد حج پر لے جانے کا اہتمام کریں۔ اگر مشیت الٰہی کی وجہ سے وہ حج نہ کر سکیں تو ان کا اجر ثابت ہے اور اصل مطلوب تو اجر ہی ہے۔

مشکوۃ شریف کے باب المساجد و مواضع الصلوۃ میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں اشعار پڑھنے سے منع فرمایا ہے اور خرید و فروخت سے بھی' اور جمعہ کے دن جمعہ کی نماز سے پہلے حلقہ باندھ کر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا ہے (ابو داود، ترمذی)۔ اس حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ کیا جمعے کی نماز سے پہلے مسجد میں جماعت اسلامی کا اجلاس منعقد کیا جا سکتا ہے؟ اگر کیا جا سکتا ہے تو اس حدیث کے آخری حصے کا مفہوم کیا ہے؟

نماز جمعہ سے پہلے' مسجد میں یا مسجد سے باہر' جماعت اسلامی کا اجتماع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس

اجتماع کو نماز جمعہ سے پہلے ختم کر دینا چاہیے۔ حدیث شریف میں نماز جمعہ سے پہلے حلقے بنا کر بیٹھنے کی جو ممانعت آئی ہے اس کا مقصد خطیب کا خطبہ سننے کے بجائے حلقے بنا کر بیٹھنے سے روکنا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تمام لوگوں کو یکسو ہو کر ایک امام کی طرف توجہ کرنا چاہیے، نہ یہ کہ اپنی اپنی ٹولیاں بنا لیں اور افتراق و انتشار کا مظاہرہ کریں۔

۱۔ کئی لوگ اپنے گزرے ہوئے بزرگوں کو ثواب پہنچانے کے لیے پوری شب میں ختم قرآن مسجد کے لاؤڈ سپیکروں پر کراتے ہیں۔ آواز بہت دور تک جاتی ہے۔ بہت کم لوگ اسے توجہ سے سنتے ہیں۔ اس دوران رفع حاجت کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

۲۔ جمعہ کے دن لاؤڈ سپیکر پر ایک مسجد میں خطبہ پڑھا جا رہا ہوتا ہے دوسری مسجد میں تقریر ہو رہی ہوتی ہے، تیسری مسجد میں قرآن مجید کی تلاوت ہو رہی ہوتی ہے، چوتھی مسجد میں جماعت ہو رہی ہوتی ہے۔ کیا امام صاحبان کو ایسا کرنا چاہیے، آوازیں گڈمڈ ہو رہی ہوتی ہیں اور نمازی نماز بھول جاتے ہیں۔

۳۔ جب کسی امام صاحب کا دل کرتا ہے، لاؤڈ سپیکر پر تلاوت، حمد، نعت خوانی یا مسجد کی تعمیر کے لیے چندہ مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی چندہ دیتا ہے تو کہا جاتا ہے، فلاں نے اتنی رقم دی ہے اور یہ سلسلہ کافی دیر چلتا رہتا ہے۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

۴۔ جب مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر قرآن کی تلاوت ہو رہی ہو، تو جن گھروں تک آواز پہنچ رہی ہو ان کو کیا کرنا چاہیے، اور جن گھروں تک آواز صاف نہ پہنچ رہی ہو ان کو کیا کرنا چاہیے؟

۵۔ شبینہ میں جب تلاوت کی آواز سینکڑوں گھروں تک پہنچ رہی ہو، تو لوگوں کو کیا کرنا چاہیے؟

۶۔ کیا مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر کسی کی موت اور نماز جنازہ کا وقت بتایا جا سکتا ہے؟

قرآن پاک کا ادب تقاضا کرتا ہے کہ اسے ان لوگوں کے سامنے پڑھا جائے جو اسے سننا چاہتے ہوں، اور ایسے حال میں پڑھا جائے جبکہ لوگ اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہوں۔ آج کل لاؤڈ سپیکروں پر قرآن پاک کی تلاوت کا جو طریقہ رائج ہے وہ کسی کے نزدیک بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ ایصال ثواب کے لیے قرآن پاک پڑھنا ہو تو اسے باوقار انداز سے ایسے لوگ پڑھیں جو خشوع اور خضوع کے حامل ہوں، اور مجلس میں سننے والے ایسے لوگ ہوں جو اسی غرض سے بیٹھے ہوں۔ خطبات جمعہ میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال حسب ضرورت اور حسب حاجت ہونا چاہیے۔ ایسی شکل سے احتراز کیا جائے جس میں لوگوں کی نمازیں متاثر ہوں، مختلف مساجد کی جماعتوں کے اندر خلل پیدا ہو، اور نمازی اپنی تسبیحات اور قرات بھول جاتے ہوں۔ لاؤڈ سپیکر کا استعمال چندہ کے لیے نامناسب ہے۔ اسی طرح حمد اور نعت خوانی کے لیے بھی اسے ایسے مواقع پر استعمال کرنا چاہیے جب لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ لاؤڈ سپیکر پر نماز جنازہ کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ شبینہ میں بھی لاؤڈ سپیکر کا استعمال مسجد تک محدود ہونا

چاہیے۔ گھروں میں تلاوت کی آواز پہنچ رہی ہو تو حتی الامکان سننے کی کوشش کی جائے، اور امام صاحب سے گزارش کی جائے کہ وہ اس سلسلہ میں سپیکر کا استعمال مسجد تک محدود کر دیں۔
(عبدالمالک)

جماعت اسلامی جمہوریت پر یقین رکھتی ہے، اس بنیاد پر مجھے امید ہے کہ یہ میرا جواب شائع کر دیا جائے گا۔

اگست کے ترجمان القرآن میں آپ کے جواب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سالگرہ تقریبات آپ کے نزدیک اسلامی طریقہ سے سادگی سے منائی جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تقریبات کس کی ایجاد ہیں؟ اگر یہ مسلمانوں کا رواج رہا تھا تو پھر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سالگرہ کی تقریبات جائز ہیں، نمائش دکھاوے کے بغیر اسلامی طرز پر سادگی سے یہ تقریب منائی جائے۔ لیکن میرے نزدیک شادی بیاہ کی سالگرہ، بچوں کی سالگرہ کی تقریبات مشرکوں کی ایجاد اور فعل ہے، جنھوں نے دنیا کی زندگی کو کھیل تماشا سمجھ رکھا ہے۔ ان کی نقل انسان کو دنیا ہی میں جہنم رسید کر دیتی ہے۔

کافروں اور مشرکوں کے ہر عمل کی آنحضور ؐ نفی کرتے تھے۔ مثال کے طور پر عیسائی سفید داڑھی رکھنا اچھا سمجھتے تھے، آنحضور ؐ نے کہا، داڑھی کو رنگ کرو۔

اسلام کے اندر تیسری راہ کی گنجائش نہیں ہے، اسلام صرف دو ہی راہ بتاتا ہے۔ ایک صحیح اور دوسری غلط۔ گول مول سیاسی باتوں سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تیسری راہ صرف باغی عالم کی ہوتی ہے، جو علم ہونے کے باوجود حقیقت کو مسخ کر کے پیش کرتا ہے۔ لوگوں کی رعایت اور اپنے نفس کے فائدہ کے لیے۔ یہودی ہفتہ کے دن مچھلی پکڑنے کے بجائے جال پھینک دیتے تھے اور اتوار کے دن شکار گھر لاتے تھے۔ یہ تیسری راہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا حکم اپنی مرضی سے مانیں گے۔

حرام چیزوں کی گرہ کھولنے کے لیے سوالات وہی کرتے ہیں جن کے دل میں روگ اور بیماری ہوتی ہے، جو دین کی حرام کردہ باتوں میں راہ تلاش کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل نے گائے کو ذبح کرنے سے بچنے کے لیے سوالات کی بوچھاڑ صرف خدا کے حکم کو ٹالنے کے لیے کی تھی۔

آپ کے اس جواب سے وہ لوگ جو سالگرہ کی تقریبات دل میں چور رکھ کر مناتے تھے، اب سکون کے ساتھ دل کی تسلی سے منا سکیں گے۔ اگر یہ عمل خدا کے نزدیک پسندیدہ ہوا تو آپ ثواب کے حق دار ہوں گے، ورنہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کو معاف کر دیتا ہے۔

میرے نزدیک اصل اہمیت اس اختلاف کی نہیں ہے کہ سالگرہ جیسا فعل فی نفسہ مباح ہے، یا ایسا حرام کہ جہنم رسید کر دے۔ بلکہ اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم شریعت کے حکم کے بارہ میں رائے قائم کرنے اور اس کے اظہار میں، تشریح اور افتا کے بنیادی اصولوں کی پابندی کریں۔ ان اصولوں کا

فہم نہ ہو' اور ان کی خلاف ورزی ہو' تو دین میں غلو' تشدد اور تحریف کا راستہ کھل جاتا ہے' شریعت اصر و اغلال (بوجھ اور بیڑیوں) کا مجموعہ بن جاتی ہے' اور اختلاف' افتراق و فساد میں بدل جاتا ہے۔ میرے جوابات کا مقصد حکم شرعی کے بارہ میں فتویٰ نہیں' حکمت شرعی کی تعلیم ہوتا ہے۔

سب سے بنیادی اصول یہ ہے کہ تحریم و تحلیل کا اختیار صرف اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہے۔ اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں کہ انسان ایسے ہی زبان ہلا دے کہ یہ حرام ہے اور یہ حلال' الا یہ کہ اس کے پاس مضبوط سند ہو۔ کسی انسان کی فہم' رائے یا اجتہاد کو منشائے الٰہی کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا' سوائے اس کے رسول ؐ کے۔ اسی لیے ہر مفتی اپنے فتویٰ کے ساتھ یہ ضرور لکھتا ہے کہ "یہ میری رائے ہے' اور صحیح علم تو اللہ کے پاس ہے"۔ اسی لیے سلف حرام و حلال کے الفاظ استعمال کرنے کے بجائے یہ کہتے کہ "یہ میرے نزدیک پسندیدہ ہے' یہ مجھے پسند نہیں۔" جہاں وہ حرمت کے قائل بھی ہوتے' وہاں بھی اکثر وہ صرف مکروہ کہنے پر اکتفا کرتے۔

دوسرا اہم اصول یہ ہے کہ سب اشیا و معاملات اصلاً مباح ہیں' الا یہ کہ ان کی حرمت ثابت ہو۔ حرمت ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے' حلت اور اباحت ثابت کرنے کے لیے نہیں۔

تیسرا اہم اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرائض' محرمات اور حدود کا تعین ضرور کیا ہے' لیکن بے شمار اشیا و معاملات میں "اس نے خاموشی اختیار کی ہے' ہمارے اوپر رحمت کی خاطر' نہ کہ اس لیے کہ اس سے بھول چوک ہوگئی۔ ان چیزوں میں کھوج کرید کرنا منع ہے" (دارقطنی)۔ جو شخص خواہ مخواہ سوال اور بحث سے ایسی چیز کو حرام کر دے' جو حلال ہو' (یا اس چیز کو فرض کر دے جو فرض نہ ہو)' وہ "مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم" قرار دیا گیا ہے (بخاری، مسلم)۔ اس لیے جہاں شارع نے خاموشی اختیار کی ہے وہ مباح ہے' اور مباح کا دائرہ غیر محدود ہے' الا یہ کہ نص شرعی کے تحت محدود ہو۔

اس لیے تیسرا اہم اصول یہ ہے کہ حلال کو حرام کر دینا اتنا ہی سخت قابل اجتناب ہے جتنا حرام کو حلال کرنا۔ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ اسی لیے فرمایا گیا ہے' اور یُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰت کا فریضہ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا۔

کوئی چیز اس لیے نہیں حلال ہو جاتی کہ مسلمانوں کی ایجاد و رواج ہے' نہ اس لیے حرام ہو جاتی ہے کہ کافروں (اہل کتاب ہوں یا مشرک) کی ایجاد ہے۔ حضور ؐ نے جاہلیت کے تمدن و معاشرت اور رسوم و رواج میں ان چیزوں کو برقرار رکھا جن میں کوئی قباحت نہ تھی' جن میں اصلاح کی گنجائش تھی' ان کو اصلاح کر کے برقرار رکھا' اور صرف انہی چیزوں کو ختم کیا جو فی نفسہ مفسد تھیں یا ذریعہ فساد۔ اس

کی بے شمار مثالیں ہیں جن کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ ؐ یہود و نصاریٰ کی ان چیزوں کی بھی پیروی فرماتے جن میں قباحت نہ ہوتی، یا جب تک آپ کو ان کے متبادل کوئی چیز نہ دے دی جاتی، مثلاً قبلہ اور عاشورہ کا روزہ۔ آپ کو یہودیوں کی تجہیز و تکفین رسوم کا علم ہو تو آپ ہماری ان سے مماثلت پر تعجب کریں گے۔

یہ بات درست نہیں کہ شریعت صرف دو ہی راہیں بتاتی ہے: ایک صحیح اور دوسری غلط (یعنی حلال یا حرام)۔ آپ جانتے ہیں کہ فقہا کے نزدیک تین راہیں اور ہیں: مستحب، مکروہ اور مباح۔ اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے بارہ میں دو میں سے ایک ہی رائے صحیح ہو سکتی ہے، اور جو اس کے خلاف رائے رکھے وہ باغی ہے اور اپنے نفس کے فائدہ کی خاطر حقیقت کو مسخ کر رہا ہے، اور جو میری رائے ہے بس وہی حق ہے، تو یہ بھی درست نہیں۔ صحابہ کرام اور سلف کے درمیان اکثر باتوں میں اختلاف موجود تھا، ایک گروہ کی رائے میں ایک رائے صحیح تھی تو دوسرے گروہ کی رائے میں دوسری صحیح۔ خلافت کا حق کسے حاصل ہے، معراج جسمانی تھی یا روحانی، ایک مجلس کی تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں یا نہیں، کس چیز سے وضو ٹوٹتا ہے اور کس سے نہیں، شطرنج حرام ہے یا مباح --- ایک نہیں، لاتعداد مسائل ہیں جن میں آپ یہ اختلاف رائے پائیں گے۔ مگر وہ ایک دوسرے پر دل کے روگ کا الزام نہیں لگاتے تھے، نہ ان کو جہنم رسید کرتے تھے، نہ ان کو دعوت توبہ دیا کرتے تھے۔ خود حضور ؐ کے سامنے صحابہ ؓ نے آپ ؐ کے ایک ہی حکم کی دو مختلف تعبیریں کیں اور حضور ؐ نے کسی کو غلط نہیں قرار دیا۔

یہ صحیح ہے کہ بنی اسرائیل نے گائے کے بارہ میں سوالات کی بوچھاڑ خدا کا حکم ٹالنے کے لیے کی تھی، مگر آپ نے یہ غور نہیں کیا کہ ہر سوال کے نتیجہ میں انھوں نے اپنے لیے کون کون سی "حلال گائیں" حرام کر لیں۔ پہلے ہر کم عمر اور بوڑھی گائے، پھر زرد رنگ کے علاوہ ہر رنگ کی گائے، پھر ہل چلانے والی اور پانی کھینچنے والی گائے۔ اگر وہ پہلے ہی حکم کی تعمیل کر دیتے اور بحث و تمحیص میں نہ پڑتے، تو جس گائے کی بھی قربانی کر دیتے، حکم کی تعمیل ہو جاتی۔ گویا یہ نہ تھا کہ ایک ہی گائے کی قربانی "صحیح" ہو، ہر گائے کی قربانی صحیح تھی۔

جب انسان، تشریع کے بنیادی اصولوں سے واقف نہ ہو یا ان کو ملحوظ نہ رکھے، اور حق پر اپنی اجارہ داری سمجھے، تو پھر گفتار و روش میں وہ ساری بے اعتدالیاں پیدا ہوتی ہیں جن کی وجہ سے آج امت شریعت کی صاف، آسان اور سیدھی راہ سے ہٹ گئی ہے، اور سید ناصح ؒ کے الفاظ میں شریعت ایک ایسا بوجھ بنا دی گئی ہے جس کو اٹھانا ایک عام آدمی کے بس میں نہیں رہا۔

اسلام کا دین سب کے لیے ہے اور ہر زمانہ کے لیے ہے۔ اس لیے تمدن و معاشرت میں بے شمار رائج طریقوں کو مسلمانوں نے قبول کیا ہے اور برقرار رکھا ہے۔ نوروز کا تہوار ایران میں زمانہ قدیم سے چلا آ رہا تھا۔ یہ دن اسلام کے عہد میں بھی ایران و عراق میں منایا جاتا رہا اور خلافت عثمانیہ کے کئی علاقوں میں اس دن چھٹی کی جاتی رہی ہے۔ اگر آپ ایجاد کی بحث میں جائیں گے تو ان اہل قرآن کی طرح الجھ جائیں گے جنھوں نے نماز کو بھی مجوس کی ایجاد قرار دیا' یا میزان اور بہشت و دوزخ کو زردشت کی تعلیمات کا نتیجہ۔ اگر آج سارے اہل مغرب مسلمان ہو جائیں اور وہ اپنی سالگرہ کی تقریبات کو مفاسد سے پاک کر لیں' تو کیا ہم ان سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ان کو بالکل ترک کر دو ورنہ جہنم رسید ہو جاؤ گے؟

امید ہے آپ ان باتوں پر غور کریں گے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اپنی رائے پر قائم رہیں تو کوئی ایسی بات نہیں۔ جیسا میں نے لکھا ہے کئی اہم چیزوں کے صحیح یا غلط ہونے کے بارہ میں صحابہ کرام ؓ اور سلف کے درمیان سنگین اختلافات پائے جاتے تھے' مگر وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ دوسری رائے دین کی حرام کردہ باتوں میں راہ تلاش کرنے کے لیے ہے۔

جماعت اسلامی یقیناً ان معنوں میں جمہوریت پر یقین رکھتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی' بالخصوص ریاستی معاملات اور ان کے حکمرانوں کا عزل و نصب ان کی مرضی سے طے ہونا چاہیے۔ مگر اس جمہوریت کا یہ تقاضا نہیں بنتا کہ ترجمان القرآن اپنے ہر مکتوب نگار کا جواب ضرور شائع کرے' پھر تو ہمارا ایک صفحہ بھی باقی نہ بچے گا۔ میں آپ کا خط صرف اس لیے شائع کر رہا ہوں کہ یہ چند اہم بنیادی مسائل کو واضح کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ویسے آپ نے مکتوب الیہ کو خط ملنے اور اس کا جواب پانے سے پیشتر ہی اپنے شہر کے تمام وابستگان تحریک کے درمیان اپنے خط کی نقول تقسیم کر کے اپنا جمہوری حق استعمال کر لیا ہے اگرچہ آداب مکتوب نگاری کا تقاضا یہ تھا کہ آپ مکتوب الیہ کے جواب کے ساتھ اپنے خط کی تقسیم کرتے۔ (خرم مراد)

کتاب نما

۱- پاکستان میں نفاذ اسلام: ۴۴۴ صفحات- قیمت ۱۲۰ روپے
۲- پاکستان' بھارت اور عالم اسلام: ۲۷۴ صفحات- قیمت ۸۰ روپے
۳- جمہوریت' پارلیمنٹ اور اسلام: ۴۴۴ صفحات- قیمت ۱۲۰ روپے
۴- پاکستانی سیاست اور آئین: ۴۱۲ صفحات' قیمت ۱۲۰ روپے

از پروفیسر خورشید احمد مرتبین: سجاول خان رانجھا' مسلم سجاد' خالد رحمٰن- ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز' مرکز ایف ۷' نصر چیمبر' اسلام آباد-

یہ سینٹ آف پاکستان میں کی جانے والی تقریروں کے انتخاب پر مشتمل مجموعے ہیں- گویا ایک ہی سلسلے کے چار حصے ہیں- چاروں کتب کو موضوعات کی مناسبت سے الگ الگ مدون کیا گیا ہے-

پاکستان کا قیام جن ارفع و اعلیٰ مقاصد کے لیے عمل میں لایا گیا تھا' بد قسمتی سے' ہمارا نصف صدی پر محیط' اب تک کا اجتماعی سفر' ان مقاصد کی سمت کسی پیش رفت کا حامل نہیں ہے- علاوہ دیگر اسباب کے' اس بد قسمتی کا ایک بڑا سبب ہمارے ہاں قومی اداروں کی زندگیوں کا عدم تسلسل ہے- قومیں اور معاشرے قومی اداروں کے تسلسل اور ان کی مثبت روایات کے جلو میں آگے بڑھتے ہیں- اگر معاشی' معاشرتی' سماجی اور سیاسی ادارے روبہ زوال ہوں' قائم ہی نہ رہ سکیں یا ناقابل رشک روایات کے نمونے بن جائیں تو قوموں کی حالت ایسی ہی ہوا کرتی ہے جیسی کچھ اب ہماری ہے-

ہمارے سیاسی اداروں پر ۱۹۵۲' ۱۹۵۸' ۱۹۶۹ اور ۱۹۷۷ میں جو کچھ گزری ہے' اس کی روشنی میں سیاسی اداروں کے اضمحلال کے اسباب بخوبی سمجھے جاسکتے ہیں- ۱۹۷۳ کے متفقہ دستور کی رو سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی دو ایوانی مقننہ میں سینٹ آف پاکستان کو ایوان بالا قرار دیا گیا اور اسی دستور کے آرٹیکل ۵۹ کی شق ۳ میں اس ادارے کو غیر تحلیل پذیر قرار دیا گیا- لیکن برا ہو اقتدار کے دست آز کا' جس نے ۱۹۷۷ میں اس ادارے کو بھی تحلیل کر ڈالا- بہرحال آٹھ برس کے تعطل کے بعد ۱۹۸۵ میں یہ محترم ادارہ بحال ہوا' اور اب تک مسلسل اپنے فرائض کی بجا آوری میں مصروف ہے-

پروفیسر خورشید احمد' ۱۹۸۵ سے اب تک سینٹ کے رکن منتخب ہوتے چلے آرہے ہیں- اس کے

ساتھ ساتھ وہ دنیا کے اور بہت سے علمی، تحقیقی اور معاشی اداروں سے بھی ذمہ دارانہ حیثیتوں سے وابستہ ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی سولہ اردو اور اٹھارہ انگریزی تصانیف بھی شائع ہو چکی ہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں: مثلاً عربی، فرانسیسی، ترکی، بنگالی، جاپانی، یوگوسلاوی، جرمن، انڈونیشی، ہندی، چینی، کورین اور فارسی میں ان کی کتابوں کے تراجم بھی ہو چکے ہیں۔

سینٹ آف پاکستان میں ان کی تقاریر کے زیر تبصرہ مجموعوں میں پہلے حصے (پاکستان میں نفاذ اسلام) میں اسلامی ریاست، اسلامی نظریاتی کونسل، شریعت کی بالادستی اور نظام زکوۃ کے نفاذ کے موضوعات پر تقاریر شامل ہیں۔ پروفیسر صاحب نے اس امر پر زور دیا ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں شریعت کی بالادستی قائم کیے بغیر نہ تو مطلوبہ اسلامی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے اور نہ پاکستان نمونے کی اسلامی ریاست بن سکتا ہے، جو قیام پاکستان کی غرض و غایت تھی۔

دوسرے حصے (پاکستان، بھارت اور عالم اسلام) میں خارجہ پالیسی، افغانستان، بھارت، کشمیر اور عالم اسلام کے اہم مسائل اور بحیثیت مجموعی پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشکیل نو کے لیے رہنما اصولوں پر مفصل اظہار خیال ملتا ہے۔ خورشید صاحب کا خیال ہے کہ ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے ہماری خارجہ پالیسی کا ہدف ایک عادلانہ عالمی نظام کا قیام ہونا چاہیے۔ اسی طرح ہماری "اسلامی خارجہ پالیسی کو غیر فرقہ وارانہ ہونا چاہیے۔ ہمیں اسلامی حدود میں ایسے طریقہ کار وضع کرنا چاہییں جن سے پاکستان اور افغانستان میں شیعہ اقلیت اور ایران میں سنی اقلیت کے حقوق کو تحفظ اور ضمانت ملے اور یہ ملک اسلامی ہم مقصدیت کے باب میں باہم رواداری کی ایک روشن مثال قائم کر سکیں"۔ (ص ۱۸)۔

تیسرے حصے (جمہوریت، پارلیمنٹ اور اسلام) میں سیاسی جماعتوں کی بحالی، آٹھویں ترمیم اور متعلقہ معاہدہ، نوکر شاہی اور جمہوری روایات، جائزہ و احتساب (جونیجو، پی پی پی اور آئی جے آئی کی حکومتیں) آزادی اظہار اور امن عامہ کے مسائل پر بحث شامل ہے۔ یہ بحث محض نظری نہیں، بلکہ اس میں ملک و قوم کو درپیش عملی مسائل سے بھی تعرض کیا گیا ہے۔ پاکستان کی گذشتہ دس سالہ سیاست کے نشیب و فراز کی اس داستان سے، سینٹ میں جمہوریت، پارلیمنٹ اور خود نظریہ پاکستان کے تحفظ کے لیے، پروفیسر خورشید احمد کی کاوشوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

چوتھا اور آخری حصہ (پاکستانی سیاست اور آئین) وفاق اور صوبوں کے تعلقات، صدر کے صوابدیدی اختیارات، دستور اور تعبیر دستور اور سینٹ کا کردار، ایسے موضوعات پر پروفیسر موصوف کی تقاریر کا مجموعہ ہے۔

ہر تقریر میں متعلقہ موضوع کی جزئیات تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر صاحب زیر بحث موضوع کو اس کے وسیع تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں اور مختلف ادوار میں اس کی بدلتی ہوئی شکلوں کا جائزہ لیتے ہوئے

اس کی آخری صورت تک پہنچتے ہیں۔ یہ انداز کسی سیاست دان کی بجائے ایک ایسے اسکالر کا ہے، جو اپنے موضوع سے بخوبی واقفیت کے ساتھ اظہار خیال پر بھی قدرت رکھتا ہو۔ قاری کے لیے یہ امر باعث مسرت ہے کہ ان مجموعوں کی ہر تقریر بہت محنت، توجہ اور لگن سے تیار کی گئی ہے۔ تاریخی حوالوں اقتباسات اور تقابلی جائزوں نے ان تقاریر کو وقتی موضوعات پر ہونے کے باوجود مستقل اہمیت کی چیز بنا دیا ہے۔ ہمارے ہاں اول تو سیاسی فورموں پر اس قدر سنجیدگی اور محنت کے ساتھ تقریریں کرنے کا رواج ہی نہیں ہے، اور پھر اس نوع کی تقریروں کو تحریری طور پر محفوظ کرنے کا چلن تو بالکل ہی نہیں ہے۔ سوائے چند گنی چنی مثالوں کے (علامہ اقبال، قائداعظم میاں افتخار الدین اور مولانا عبدالحق کی تقریریں مدون و شائع کی جا چکی ہیں)۔ ہم اس نوع کے کسی مجموعے کا نام نہیں لے سکتے۔

ان مجموعوں میں اس قدر وسیع دوائر اور اتنے متنوع موضوعات پر کلام کیا گیا ہے کہ ایک قاری، اگر کہیں مصنف کے نقطہ نظر سے اختلاف محسوس کرے تو یہ امر بالکل قدرتی ہو گا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ پروفیسر خورشید احمد کی تقاریر کے یہ مجموعے اپنے موضوعات کے ساتھ ان کی گہری دلچسپی، سنجیدگی اور اخلاص کے مظہر ہیں۔ ان مجموعوں کو بلاتامل ہماری سیاسی و ملی تاریخ کی ایک اہم دستاویز قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ چاروں مجموعے نہایت خوب صورت گٹ اپ کے ساتھ بہت اہتمام سے شائع کیے گئے ہیں۔ مضبوط اور مطلا جلدیں، دیدہ زیب گرد پوش، کمپیوٹر کی کمپوزنگ اور آفسٹ کاغذ نے حسن طباعت کا ایک معیار قائم کیا ہے۔ کہیں کہیں کتابت اور تدوین کی بعض خامیاں نظر آتی ہیں اور اس کے ساتھ وضاحتی اور تعارفی حاشیوں کی کمی بھی نظر آتی ہے مصنف نے ہر مجموعے کے پیش لفظ میں بالالتزام مرتبین کی "محنت" اور "عرق ریزی" کا ذکر کیا ہے اور اسی سے مرتبین کے ناموں کا پتا چلتا ہے، مگر تعجب ہے کہ مرتبین کے نام، کتاب کے اندرونی یا بیرونی سرورق، پرنٹ لائن کے صفحے یا خود مرتبین کی تحریر کردہ تمہیدی سطور کے آخر میں، کہیں درج نہیں ہیں۔ یہ تدوینی سقم اصلاح طلب ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم سیاست، تاریخ اور سماجیات کے طالب علموں کے لیے، متعلقہ مسائل کی تفہیم اور صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (زاہد منیر عامر)

سید مودودی کے جانشین اول، میاں طفیل محمد: مرتب، پروفیسر کریم بخش نظامانی۔ تسنیم پبلی کیشنز، چوک اردو بازار، لاہور صفحات ۲۹۳۔ قیمت ۵۰۱ روپے۔

۱۹۳۹ میں ایک نوجوان وکیل نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سن کر ان سے سوال کیا "خدارا مجھے بتائیے کہ ان حالات میں مخلص نوجوان کدھر جائیں؟" شاہ صاحب کا جواب تھا: "بھائی

وکیل صاحب ' ایمان کی پوچھتے ہو تو یہی بات وہی ہے جو مودودی کہتا ہے۔ باقی سب دنیا اور پیٹ کے دھندے ہیں ' اس لیے اگر ایمانداری سے دین کی خدمت کرنا چاہتے ہو تو اس سید کے پاس جاؤ ' (ص ۸۸)۔ پھر کیا تھا ' گویا کہ انھوں نے اپنی منزل پالی۔ ۲۶ اگست ۱۹۴۱ کو حلف رکنیت اٹھایا۔ تحریک کو علی وجہ البصیرت قبول کرنے کا اعلان کیا اور پھر ساری عمر کے لیے ' اسی کے ہو رہے۔

۴ نومبر ۱۹۸۷ کو محترم قاضی حسین احمد کے حلف امارت اٹھانے کے موقع پر میاں صاحب نے جماعت اسلامی سے اپنے تعلق کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: "میں روز تاسیس سے جماعت اسلامی میں شامل ہوں۔ میں آج جامع مسجد منصورہ میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ساری زندگی میں جماعت کے کام کے سوا کسی اور کام میں دلچسپی نہیں لی ' کسی ذاتی کام یا کسی خاندانی مسئلے یا دنیاوی مصروفیت سے خود کو دور رکھا ' اپنا سارا وقت ' محنت ' صلاحیت اور قابلیت جماعت کے لیے وقف رکھی"۔

تحریک اسلامی سے وابستگی میں یکسوئی ' درویشانہ افتاد طبع ' للہیت ' بے لوثی و بے نفسی اور عجز و انکسار کو میاں طفیل محمد کی شخصیت کے اہم عناصر کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ ان کی بے نفسی کا عالم دیکھیں کہ جب زیر نظر کتاب کے مرتب ان سے انٹرویو لینے جاتے ہیں ' تو جواب ملتا ہے: "نظامانی صاحب ' اس دنیا سے ہمیں یوں ہی جانے دیجیے۔" (ص -۱۲) اور یہ واقعہ کتنا عجیب اور سبق آموز ہے: "میں دارالاسلام میں مستقل قیام کے پروگرام کے ساتھ ستمبر کی ایک خنک شام سرنا ریلوے اسٹیشن پر بھاری بھرکم گرم بستر اور ایک ٹرنک کے ساتھ پلیٹ فارم پر اترا کہ اچانک ایک صاحب نے میرا بستر السلام علیکم کی گرم جوش آواز کے ساتھ اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ وہ کل ہند جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل طفیل محمد تھے۔" (راوی عبدالوحید خاں)

اصول پسندی کی خاطر میاں صاحب نے آٹھ مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں ' مگر ان کے عزم و استقامت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ بھٹو دور میں ایک موقع پر جب میاں صاحب زیادتی کا نشانہ بننے والے تھے ' فرمایا: "میری طرف سے جا کر اس سے کہہ دو کہ فلاں جگہ پر میرا ایک مختصر سا مکان ہے اور فلاں فلاں جگہ میری ملکیتی اراضی ہے ' وہ جو کچھ مجھ سے چھین سکتا ہے ' چھین لے۔ میرے اعزہ و اقربا پر زیادتی کر سکتا ہے ' کر لے۔ لیکن یہ غلط فہمی اپنے دل سے نکال دے کہ اس کے اس قسم کے اقدامات سے میں اپنے موقف میں یا اپنے طرز فکر میں ذرہ بھر تبدیلی کر لوں گا۔" (ص ۲۸۸)

میاں صاحب کی شخصیت اور خدمات پر مضامین کا یہ مجموعہ پروفیسر کریم بخش نظامانی نے بڑی محبت اور محنت و کاوش سے مرتب کیا ہے۔ لکھنے اور تاثرات پیش کرنے والوں میں مولانا فتح محمد ' جناب نعیم صدیقی ' ملک غلام علی ' مولانا گلزار احمد مظاہری ' جناب عبدالوحید خان ' محمد اکرم رانجھا ' حافظ محمد ادریس اور جناب مصطفیٰ صادق شامل ہیں۔

مولانا فتح محمد نے بڑی محنت سے مختلف حقائق جمع کیے ہیں اور اکرم رانجھا صاحب نے میاں صاحب کی دل نواز و دل کش شخصیت اور ان کے داعیانہ کردار کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ان کے بقول:

"محترم میاں صاحب ' مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی "جیسے شجر سایہ دار سے فیض یاب ہوئے اور ان کی راہنمائی کو پورے طور پر جذب کیا۔ اور اس کتاب کا مقصد میاں صاحب کی ذات سے محض اظہار محبت و عقیدت نہیں 'بلکہ ان کے کام ' ان کی حکمت اور انہماک کے اسی انداز کو پیش کرنا ہے جس سے تحریک اسلامی کے وابستگان اپنے لیے رہنمائی حاصل کر سکیں۔"

آخر میں پروفیسر نظامانی کا تعارف بھی شامل کتاب ہے۔ کتاب کا معیار طباعت و اشاعت اطمینان بخش ہے۔ کاغذی جلد (پیپر بیک) اچھی ' سرورق جاذب نظر اور قیمت بہت مناسب ہے۔ (ڈاکٹر منصور علی)

نیو ورلڈ آرڈر: امجد حیات ملک۔ ناشر: احمد حیات ملک 'مصنف ۲۴۳ بی نیو چوبرجی پارک ' لاہور۔ صفحات ۲۱۷- قیمت ۱۵۰ روپے۔

اکتوبر ۱۹۹۱ میں شائع ہونے والی زیر نظر کتاب کا بنیادی خیال یہ ہے کہ "نیو ورلڈ آرڈر" کی جڑیں دراصل بہت گہری ہیں ' اور اس کا مقصد مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا اور دنیا پر عیسائیت کا سکہ جمانا ہے۔ یہودی اور عیسائی تو اس کام میں ہمیشہ سرگرم عمل تھے ' اب ہنود بھی مسلمانوں کے خلاف اس بین الاقوامی سازش میں شریک ہوگئے ہیں۔ اس دعویٰ کے حق میں دیے گئے تاریخی شواہد مصنف کے وسیع مطالعے ' اور خاصی حد تک حسن انتخاب کی عکاسی کرتے ہیں۔ کتاب کا ضمنی وضاحتی عنوان ہے: "شیطانی آیات کی تحریک ' ماضی کے آئینے میں"۔

باب اول کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ رشدی کی انتہائی دل آزار کتاب کوئی اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ ایک بڑے منصوبے کی کڑی ہے۔ یہاں مصنف نے "نیو ورلڈ آرڈر" کے اغراض و مقاصد ' محرکات اور ہتھکنڈوں کی طرف واضح اشارے بھی کیے گئے ہیں ' جس کی ایک جھلک خلیج کی جنگ کے زمانے میں دنیا کے سامنے آئی۔ (یہ باب ۱۹۸۹ کی تحریر ہے) باقی ابواب (جو صلیبی جنگوں ' منگول حملے ' داستان اندلس ' افریقی غلاموں کی تجارت اور یہودیوں کی قومی تاریخ پر محیط ہیں) ' پہلے باب میں مذکور خیالات کے حق میں تاریخی شواہد پر مشتمل ہیں۔

آٹھ صدیوں پر محیط کفر و اسلام کی تاریخی کشمکش کو تین سو صفحات میں اس طرح سمیٹنا کہ صورت حال کی صحیح عکاسی بھی ہو ' آسان کام نہیں۔ شاید اسی مشکل کے سبب کئی اہم تاریخی واقعات کتاب میں جگہ نہیں پا سکے ' مگر دوسری طرف اندلس کی غیر متعلق تفصیلات شامل کتاب کر دی گئی ہیں۔ ۱۴۰ صفحات پر مشتمل اس باب کی طوالت سے کتاب غیر متوازن ہوگئی ہے۔

مغربی تہذیب کی تمدنی چکاچوند سے، اور مغربی قوموں کی امداد سے متاثر مسلمانوں کی مرعوبیت ختم کرنے کے لیے جس کام کی ضرورت ہے، اس کے لیے یہ کتاب ایک عمدہ بنیاد مہیا کر سکتی ہے، بشرطیکہ تجزیہ و تاریخ کے کام کو ان حوالوں سے آگے بڑھایا جائے۔

۱۔ عیسائیت سے سیکولرازم کی طرف یورپ کے پانچ صدیوں کے طویل سفر کی بنا پر بہت سے لوگ یہ سوچ رکھتے ہیں کہ ماضی کا مسیحی یورپ تو ہمارا شدید دشمن تھا، مگر آج کا لادین مغرب، غیر عیسائیوں سے مذہبی بنیاد پر نفرت نہیں کرتا۔ لیکن زیر تبصرہ کتاب میں بار بار یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ "نیو ورلڈ آرڈر" آج بھی وہی ہے جو قرون وسطیٰ کے مسیحی اور تاریک یورپ میں تھا۔" (اگرچہ اس کے حق میں خاطر خواہ شواہد پیش نہیں کیے گئے)۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یورپ میں گذشتہ پانچ سو سالوں میں آنے والی تبدیلیوں کا سنجیدہ تجزیہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ آخر اجتماعی زندگی سے مسیحیت کو بے دخل کر کے (لامذہب ہو جانے کے باوجود) مسلمانوں سے یورپ کی نفرت کم کیوں نہیں ہوئی؟ یعنی ایسا کیوں ہے کہ ان کی مذہبیت، اسلام کے خلاف نفرت پیدا کرنے (یا برقرار رکھنے) کے لیے تو موثر ہوتی ہے مگر باقی معاملات میں بے اثر؟

۲۔ اس کتاب میں ایک سے زیادہ مرتبہ ایک ایسی تاریخی حقیقت کا ذکر کیا گیا ہے جس کا ادراک ہمارے ہاں تقلید مغرب کے بارے میں متوازن نقطہ نظر پیدا کرنے کے سلسلے میں خاصا موثر ہو سکتا ہے۔ جاپان نے دو سو سال تک مغربی اقوام کا تجارتی مقاطعہ کیا، جس کے نتیجے میں جاپان ایک لمبے عرصے تک اہل مغرب کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہا۔ مگر یہی وہ دور ہے جب مغل شہنشاہ ہمارے ہاں یورپی قوموں کو تجارتی کوٹھیاں بنانے کی اجازت دے رہے تھے، جن کا خفیہ ایجنڈا پہلے مشنری، پھر سوداگری اور پھر فوجی تھا۔ آج ہم اہل مغرب کو دی گئی اندھی مراعات (کی غلطی) کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اس حقیقت کا محض سرسری ذکر کافی نہیں، بلکہ اس حوالے سے مزید تجزیے اور تقلید مغرب کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ نقطہ نظر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ کتاب کے آخر میں اس بات کا تفصیلی ذکر ہے کہ یہودی قوم ظاہری سیاسی اقتدار کے بغیر محض اپنی دولت، مختلف علوم و فنون میں مہارت اور ذرائع ابلاغ پر تسلط کے ذریعے پوری دنیا پر غلبہ حاصل کر چکی ہے۔ اس حوالے سے یہ بات قابل غور ہے کہ آج کی دنیا میں سیاست کو جو کم و کیف حاصل ہے، کیا اس پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں؟ خصوصاً، کیا علمی برتری کے بغیر محض سیاسی اقتدار فی الواقع اتنا ہی اہم ہے جتنا ہم خیال کرتے ہیں اور کیا یہ خاطر خواہ نتائج کا باعث بن سکتا ہے؟

اس کتاب کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ مصنف نے مختلف واقعات و دعاوی کے حوالے نہیں دیے ہیں۔ (ڈاکٹر بلال مسعود)

REGD. NO. L 5340
PHONE : 7587916
7585590
MONTHLY TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE